اردو صحافت
اور
جنگ آزادی 1857

معصوم مرادآبادی

اردو صحافت

اور

جنگ آزادی 1857

معصوم مرادآبادی

یہ کتاب اردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی۔

اردو صحافت

اور

جنگ آزادی 1857

معصوم مرادآبادی

خبردار پبلیکیشنز

2724/10، میٹروپول مارکیٹ، موتی محل اسٹریٹ، دریا گنج، نئی دہلی-110002

نام کتاب ــــــــــ اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857
مصنف ــــــــــ معصوم مرادآبادی
تعداد ــــــــــ 500
اہتمام ــــــــــ خبردار پبلی کیشنز، نئی دہلی
کمپوزنگ ــــــــــ احمد اللہ قاسمی/غلام مصطفےٰ
طباعت ــــــــــ ایم کے آفسیٹ پرنٹرس، 1397، چوڑیوالان، دہلی-6
اشاعت ــــــــــ 2008
قیمت ــــــــــ -/100 روپے

ملنے کے پتے:-
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-6
کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-6
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-2
تخلیق کار پبلشرز، 104/B یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی-92

Urdu Sahafat Aur Jange Azadi 1857
By: Masoom Moradabadi
2008, **Rs. 100/-**
Khabardaar Publications
2724/10, Metrcpol Market, Moti Mahal Street,
Darya Ganj, New Delhi-110002

رعنا کے نام

”1857 سے لے کر 35-1930 تک ملک گیر پیمانے پر آزادی اور قومی اتحاد کے لیے جنگ کرنے کا سہرا زیادہ تر اردو اخبارات کے سر رہا، کیونکہ ہندی کے اخبار اس زمانے میں برائے نام ہی تھے۔ انگریزی کے اکثر اخبار انگریزوں کے ہم نوا تھے اور علاقائی زبانوں کے اخباروں کا حلقۂ اثر محدود تھا۔“

رئیس الدین فریدی

(آجکل، نومبر دسمبر 1983)

ترتیب

پیش لفظ

یہ 16 ستمبر 2007 کی ایک گرم صبح تھی۔ ہندی کے معروف صحافی دوست اروند کمار سنگھ نے فون پر بتایا کہ دو بجے پریس کلب آجایئے وہاں جنگ آزادی میں شہید ہونے والے صحافیوں کو خراج عقیدت پیش کیا جائے گا۔

ٹھیک دو بجے کارروائی شروع ہوگئی۔ ڈائس پر نامور صحافی اور معلم پروفیسر رام سرن جوشی کے علاوہ پریس کلب کے عہدیداران موجود تھے۔ حاضرین پر نظر پڑی تو تمام ہندی اور انگریزی صحافیوں کا مجمع تھا۔ اردو صحافیوں میں، میرے علاوہ صرف محترمہ نور جہاں ثروت موجود تھیں۔

پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے اروند کمار سنگھ نے بتایا کہ آج ہی کے دن ڈیڑھ سو سال پہلے انگریزوں نے 'دہلی اردو اخبار' کے اڈیٹر مولوی محمد باقر کو شہید کیا تھا جو کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں شہید ہونے والے پہلے صحافی ہیں۔ پروگرام کے دیگر مقررین نے بھی شہید صحافی کے طور پر مولوی محمد باقر کا نام لیا۔ اس موقع پر کئی تقریریں سنیں لیکن ہر تقریر میں مولوی محمد باقر کی بے مثال قربانی کی ہی گونج تھی۔

تعجب اس بات پر تھا کہ اردو کے اولین شہید صحافی کو یاد کرنے کی یہ تقریب پریس کلب سے وابستہ ہندی اور انگریزی صحافیوں نے برپا کی تھی۔ ہم جیسے اردو صحافیوں کو اس کی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ وہ 1857 کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کے موقع پر اردو کے اولین شہید صحافی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے کہیں جمع ہوتے کیونکہ اردو

والوں کے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وطن کی آبرو پر جان نچھاور کرنے والا اولین صحافی اردو زبان نے پیدا کیا تھا۔

مولوی محمد باقر کے 150 ویں یوم شہادت پر دہلی کے اردو صحافیوں یا کسی اردو ادارے کی طرف سے کسی تقریب کا منعقد نہ ہونا دراصل ہماری اس اجتماعی بے حسی کا ثبوت ہے جو اپنی زبان، تہذیب اور تاریخ کے تعلق سے ہمارے وجود پر طاری ہے۔ اسی بے حسی کا نتیجہ ہے کہ آج شمالی ہندوستان میں اردو زبان اور صحافت ناگفتہ بہ حالت میں ہے۔ اسی لئے مولوی محمد باقر کو یاد کرنے والے بھی غیر اردو داں تھے اور ان کی شہادت کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی روداد کو سننے والے بھی انگریزی اور ہندی کے صحافی تھے۔

اس سے قبل مئی 2007 میں دہلی اردو اکیڈمی نے 1857 کی 150 سالہ تقریبات کے سلسلے میں جو قومی سیمینار ایوان غالب میں منعقد کیا تھا، اس میں مجھے 'دہلی کی اردو صحافت اور 1857' کے موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اردو صحافت پر بعض بنیادی ماخذ کی تلاش میں مجھے لائبریریوں کا رخ کرنا پڑا تو اس محرومی کا احساس ہوا کہ جنگ آزادی 1857 میں اردو صحافت نے جو سرفروشانہ کردار ادا کیا ہے، اس کا مواد بہت منتشر اور بے ترتیب حالت میں ہے۔ اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب، تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں ملی لہٰذا میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کیا کہ اپنی تمام تر مصروفیات کو پس پشت ڈال کر اس موضوع پر کام کروں تاکہ جنگ آزادی 1857 میں اردو صحافت کے مثالی کردار کو ایک مبسوط کتاب کی صورت میں شائع کیا جا سکے۔

میں نے اس موضوع سے متعلق تقریباً ہر کتاب اور دستاویز تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیابی بھی ملی۔ نیشنل آرکائیوز کے علاوہ دہلی، علی گڑھ اور حیدرآباد کی لائبریریوں میں اس سلسلے کی جو کتابیں دستیاب ہیں ان پر لاپروائی اور بے حسی کی دبیز گرد جمع ہے۔ بعض کتابیں تو برسوں بعد جھاڑ پونچھ کر نکالی گئیں۔ ان کی حالت اتنی خستہ تھی کہ شاید آئندہ وہ آسانی سے دیکھی بھی نہ جا سکیں۔

میں نے اپنے موضوع سے انصاف کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس موضوع پر بعض چیزیں اس کتاب کے ذریعہ پہلی بار منظر عام پر آرہی ہیں۔ مثلاً جنگ آزادی کا ترجمان کہے جانے والے پہلے قومی اخبار 'پیام آزادی' کے بارے میں تفصیلات اس سے قبل اردو میں کہیں شائع نہیں ہوئیں۔ اگر اس کوشش کو قبولیت ملی تو آئندہ بھی اردو صحافت کے تشنہ گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

1857 کی جنگ آزادی کے آغاز اور انجام سے سبھی آشنا ہیں۔ انگریز سامراج کے تسلط کے خلاف ہندوستان کے باشندوں کے دل ودماغ میں نفرت اور غم وغصہ کی جو چنگاریاں سلگ رہی تھیں، انہیں 1857 کی جنگ نے شعلہ ضرور بنایا لیکن یہ شعلہ فرنگیوں کے خرمن کو خاکستر نہ کرسکا، البتہ اس کی تپش سے ان کے دل ودماغ کے پرخچے ضرور اڑ گئے۔ ہر چند کہ یہ اردو صحافت کا ابتدائی زمانہ تھا اور ابھی اس کے بال وپر بھی پوری طرح نکل نہیں پائے تھے، لیکن اپنی ابتداء میں ہی اردو صحافت کو ایک بڑے چیلنج سے گزرنا پڑا جس سے اردو صحافت میں بے مثل جرأت وبے باکی پیدا ہوئی اور اس طرح ظالم حکمراں کے سامنے کلمہ حق ادا کرنے کی ذمہ داری سب سے پہلے اردو صحافت نے اپنے کاندھوں پر لی۔ ملک کی جدوجہد آزادی میں اردو صحافت نے مجموعی طور پر جو قائدانہ کردار ادا کیا ہے، وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔

اردو صحافت کی تاریخ پر اب تک مولانا امداد صابری، محمد عتیق صدیقی، عبدالسلام خورشید، گربچن چندن اور ڈاکٹر طاہر مسعود نے جس جاں سوزی کے ساتھ کام کیا ہے، یہ کتاب اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ اردو صحافت کے ان محققوں کی انتھک محنت اور بے مثال کاموں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ تحریک ملتی رہی ہے۔

تقریباً دو صدیوں پر محیط ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ کا موضوع اتنا وسیع اور پرمغز ہے کہ اس پر جتنا بھی کام کیا جائے وہ کم ہے۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں محققین اس اہم موضوع کے نئے باب وا کریں گے اور آنے والی نسلوں کو اپنے اسلاف کی روشن تاریخ سے روشناس کرانے کی ذمہ داری نبھائیں گے۔ اس کتاب کو سپرد اشاعت

کرتے وقت چند اشخاص کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔ محترم گربچن چندن صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود اس کتاب کے لیے مقدمہ تحریر کیا۔ اپنے مشفق و محترم فضیل جعفری صاحب کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے فلیپ کے لئے اپنی قیمتی رائے سے نوازا۔ برادر مکرم شمیم طارق اور رحمت اللہ فاروقی صاحب کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے مسودہ پر نظر ثانی کی اور نہایت قیمتی مشورے دیے۔ آخر میں اپنے تینوں بیٹوں نبیل، فراز اور اعجاز کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جنھوں نے اس کتاب کی تیاری کی ہنگامہ خیز مصروفیات کے دوران اپنی تمام فرمائشوں کو مجھ سے چھپا کر پوری توجہ اپنی پڑھائی پر مبذول کی۔

معصوم مرادآبادی

11 مئی 2008

مقدمہ

1857 انیسویں صدی کا کثیر ورق سال ہے۔ یہ اس قدر رمز آمیز ہے کہ آج تک اس کے سارے بھید نہیں کھل پائے ہیں۔ بہر حال اب یہ مان لیا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں تجارت کے بھیس میں آنے والی 'ایسٹ انڈیا کمپنی' کے ذریعہ فرنگی اقتدار کا قیام سراسر خود ساختہ تھا اور 1857ء میں اس کے خلاف نام نہاد کمپنی سرکار کی غیرت مند ہندوستانی سپاہ اور عوام نے مل کر پہلی جنگ آزادی لڑی اور اپنے ابتدائی دور میں حیرت انگیز کامیابی پائی۔ یہ عوامی اتحاد اور جذبہ وطن کا فیض اور اعجاز ہی تھا ورنہ اس وقت کمپنی کی طاقت اور تاب کا یہ عالم تھا کہ ملک کے کئی علاقائی ناظمین اس کا پانی بھرنے کے لیے آمادہ رہتے تھے۔

ملک کی اس متحدہ بغاوت نے اپنی ابتدائی کامیابی کی بدولت وہ روح پرور اور لافانی درجہ حاصل کیا جس سے بعد کی نسلوں نے دل و دماغ کی حرارت پائی اور پا رہی ہیں۔ یہ حرارت سرمدی ہے جو نئی نسلوں میں حب وطن کی تحریک پیدا کرتی رہتی ہے۔ معلومہ حقائق کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ 1857ء کے زمانے میں اس حرارت اور تحریک آفریں قوت کی محرک اس دور کی فارسی اور اردو صحافت تھی جس کے ارباب اپنی رضا اور خوشی سے ملک کی سیاسی ضرورت کی مشعل راہ بنے۔ زیر نظر کتاب جو فاضل مصنف کی طویل تحقیق کا ثمرہ ہے، اس سمت کی رائے پیما ہے۔

حال ہی میں آزاد ہندوستان کے ساٹھویں سال میں 1857ء کی عظیم بغاوت کی

150 ویں تقریبات منائی گئیں جو سرکاری اور نجی سطحوں پر سال بھر تک جاری رہیں۔
اس موضوع پر مصنف سے راقم الحروف کی گفتگو کی بناء پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ کتاب اس موضوع کا حرف آخر یا اس مالا کی آخری گرہ نہیں۔ جیسے جیسے ہمارے محققوں کی دریافتوں کا سلسلہ مزید امیر ہوگا، اس موضوع کی امارت اور تحریک بڑھتی جائے گی۔ مثلاً اب تک کے معلوم مجاہد اردو اخباروں میں فاضل مصنف نے ایک اور اخبار 'پیامِ آزادی' کا اضافہ کیا ہے جس کے ناشر اور اڈیٹر بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا بیدار بخت اور نگراں نانا صاحب کے دست راست منشی عظیم اللہ خاں تھے۔

اس اخبار کے مشمولات اس قدر اہم تھے کہ 'لندن ٹائمز' کا نمائندہ دہلی سے اس کے اوریجنل پرچے لندن بھیجتا رہا۔ اس کتاب میں 'پیامِ آزادی' کے احوال پڑھنے اور استفادہ کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس موضوع پر ابھی ایسے مزید مواد کی گنجائش ہے۔ تنگِ تجارت برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی حکومت باغیوں کے احتجاج اور حوصلوں سے اس قدر پریشان ہوگئی تھی کہ اسے اپنا سامراج خطروں اور اندیشوں سے بھرا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ چنانچہ اس نے بغاوت پر قابو پانے کے فوراً بعد اپنی پیش بندی کے لیے جبر و استبداد کا نیا دور شروع کردیا تھا۔ بغاوت کے تمام ترکیبی آثار اور معاون نقوش کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ ان آثار میں اس وقت کے اخبارات، اشتہارات اور قلمی نسخے خاص طور پر شامل تھے۔ ان کی پوری تعداد یا کمپنی کی فہرست ابھی تک اہلِ فکر اور عوام کو میسر نہیں آئی۔ باغیوں اور دیگر باشعور احباب کا وہ سارا ریکارڈ برطانوی نہاں خانوں میں دفن ہے۔ اندازہ ہے کہ اس ریکارڈ کا کچھ حصہ ملک کی کئی ذخیرہ گاہوں میں بکھرا اور چھپا ہوا ہے۔ اس ریکارڈ کا کچھ نہ کچھ حصہ انشاءاللہ برآمد ہوسکتا ہے بشرطیکہ تلاش اور تحقیق ان تھک ہو۔

اس ہیچمداں کا، جو اس رچاؤ میں دلچسپی لیتا رہا ہے، یہ بھی احساس ہے کہ ہماری پہلی جنگ آزادی کی یہ تیسری گولڈن جوبلی بھی ٹھنڈی چنگاری رہی۔ جبکہ اس سے بہت توقعات تھیں لیکن اس سے ملک اور 1857ء کے عقیدت مندوں کو کیا ملا؟ بغاوت کے صرف ایک

سور مارام چندر پانڈورنگا المعروف تاتیا ٹوپے پر مرکزی حکومت کے زیر اہتمام ایک فلم بنانے کا وعدہ اور 1857ء کے شہیدوں کی یاد میں دھات کے ایک ایسے سکے کا اجراء جو دیکھتے ہی دیکھتے بیچنے اور خریدنے والوں کے ہاتھوں میں میلا اور متروک ہو جائے گا۔

تاریخ کے حقائق کا احترام کرنے والا ہر ہندوستانی حیرت و کوفت سے پوچھتا ہے کہ بغاوت کے تحریک پرور دانشور فارسی اور اردو کے صحافیوں (مولوی محمد باقر، سید جمیل الدین ہجر، مرزا بیدار بخت، منشی عظیم اللہ خاں اور دیگر) ملک کی قانونی اور آئینی حکومت کی 1857ء کی ممتاز شخصیت اور اس اقتدار کی علامت (بہادر شاہ ظفر)، چربی آمیز مفسد کارتوسوں کی مخالفت کرنے والے اوّلین شہید (منگل پانڈے) اور بغاوت کا اوّلین صور پھونکنے والی مسلم ملکہ (بیگم حضرت محل) اور دیگر ایسے بنیادی کرداروں (شہزادہ فیروز شاہ، نانا صاحب، کنور سنگھ، راؤ صاحب، رانی لکشمی بائی، رنگا راؤ، بالا راؤ، خان بہادر خاں اور دیگر) کا کیا ہوا؟

مناسب تو یہ ہے کہ قربانیوں سے بھری ہوئی جنگ آزادی کے مرکزی مقام دہلی میں اور بالخصوص بغاوت کی خشت اول کے مقام لال قلعہ کے پہلو میں کم از کم 57 میٹر بلند ایک ایسا شہید مینار بنوایا جائے جس کی مختلف منزلوں میں ان سب مجاہدوں اور شہیدوں کی یاد میں ان کے ایوان ہائے آثار تعمیر ہوں۔ مزید ان ایوانوں میں اس دور کا صحافتی ریکارڈ، تصانیف، تالیفات، تصویروں اور قلمی نسخوں کے کیٹلاگ بردار ذخیرے ہوں۔

مختصر یہ کہ شہید مینار ایک کثیر منزلہ عمارت (کمپلیکس) ہو جس کے علمی، سیاحتی اور تفریحی سب پہلو ملکی اور غیر ملکی اشخاص کے لیے قابل استفادہ ہوں۔ مزید اس میں اطلاعات کا ایک معیاری ذخیرہ نیز ایک نشریاتی ویب سائٹ ہو جو 1857ء کی ہر مطلوبہ اطلاع مہیا کر سکے۔ یہ ویب سائٹ رفتہ رفتہ آزاد ہندوستان کا عالمی مرکز آگہی بن جائے اور اس کے اعلانیہ کھلے معاشرے کا بے نظیر 'بھارت سوچنا بھون' ہو۔

دوسری گولڈن جوبلی 1957ء میں منائی گئی تھی جب موجودہ ہندوستان کی آزادی کے کئی اہم لیڈر حیات تھے۔ انھیں میں مرکزی وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد بھی

تھے، جو خود بھی مجاہد آزادی رہے تھے اور غالباً آزادی کے روزِ حصول ہی سے 1857ء کی 'قومی بغاوت' کی ایک معروضی تاریخ لکھوانا چاہتے تھے۔ اس سے قبل برطانوی حکومت یا اس کی پروردہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے زمانے میں جو تاریخیں چھپی تھیں اور بازار میں دستیاب ہیں وہ کم وبیش برطانوی خوشنودی کی پیداوار ہیں۔

بہر حال مولانا آزاد کی فرمائش پر چھاپی جانے والی کتاب جسے یقیناً حکومت ہند کی منظوری حاصل رہی ہوگی، اس امر کا مستند اعتراف ہے کہ 1857ء کی ایک حقیقی اور مکمل تاریخ لکھنے کی پختہ ضرورت ہے۔ جس کی ابتدا بھارت سرکار نے اس پہلی قومی جنگ کی صدی تقریبات پر کر دی تھی۔

وزیرِ تعلیم ہونے کے ناتے مولانا آزاد انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کے صدر نشین بھی تھے اور 1857ء سے متعلق برطانوی حکومت کا تمام ریکارڈ ان کے دائرہ اختیار میں تھا۔ چنانچہ جب 1857ء کی صدی کا سال قریب آرہا تھا تو انھوں نے 1954ء میں ملک کے ایک ممتاز محقق ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کو 1857ء کی ایک 'معروضی' اور جامع تاریخ لکھنے کے لیے منظور کیا۔ 1857ء کا تمام ریکارڈ جو وزارت تعلیم کے اپنے شعبوں یا دسترس میں تھا، ان کے سپرد کر دیا گیا۔

ڈاکٹر سین کی کاوشوں کا نتیجہ حکومت ہند کے زیرِ اہتمام 1857ء کی بغاوت کی صدی تقریبات کے افتتاح پر مئی 1957ء میں شائع ہو گیا۔ یہ ایک بڑی معلوماتی تالیف ہے جس کا تیسرا اڈیشن بھی بازار میں آچکا ہے۔

'1857' کے عنوان سے شائع ہونے والی 470 صفحات کی مذکورہ انگریزی کتاب میں پہلی بار آزاد بھارت سرکار کی طرف سے بغاوت کے اہم مقامات اور کرداروں کے (برطانوی) دستاویزی احوال پیش کئے گئے ہیں جو یقیناً مطالعے کے لائق ہیں۔ اس میں مصنف کی تحقیقات اور دریافتوں کے علاوہ خود مولانا آزاد کا 16 صفحات کا مبسوط 'پیش لفظ' (Foreword) ہے جو بذاتِ خود اس موضوع پر ایک عالمانہ مقالہ ہے۔ اس کے علاوہ خود مولف کا دو صفحات کا 'دیباچہ' (Preface) ہے

جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک وقیع کاوش ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کاوش دستیاب برطانوی ریکارڈ پر مبنی ہے جس میں فارسی اور اردو ریکارڈ کی اچھی کثرت ہے اور ان زبانوں کی توضیح وتفسیر کے لیے مناسب اور مستقل اہتمام نہیں ہو سکا تھا جس سے یہ کاوش یک رخی اور نا تمام رہی۔

'مولف' نے 'کتابیات' (Bibliography) کے حصے میں اردو اور فارسی کے ریکارڈ کی ایک فہرست کا ذکر کیا ہے لیکن کتاب میں اس کی نقل یا ترجمہ شامل نہیں۔ مولف نے اپنی کاوشوں میں زیادہ تر ایسٹ انڈیا کمپنی کے 'محکمہ خارجہ' اور 'سیاسی اور خفیہ' صیغوں کی (انگریزی) رپورٹوں کو مدنظر رکھا ہے۔ مزید اس وقت کی (برطانوی) حکومت پنجاب کے ریکارڈ جس میں مولوی رجب علی کی دستاویزیں بھی شامل ہیں۔ ان میں زیادہ تر پنجاب کی حکومت اور ناظموں سے فارسی اور اردو زبانوں میں مراسلت، 'نقل مراسلہ جات'، 'نقل سکہ جات' اور دستاویزاتِ غدر بہ عنوان 'انتظام مفسدانہ' شامل ہیں۔ مولف کی نظر میں یہ سب دستاویزیں خصوصی توجہ چاہتی ہیں۔ (جس کے لیے غالباً ڈاکٹر سین کے معاونین میں کوئی ماہر زبان نہیں تھا) اسی طرح دوسری ریاستوں میں بھی بغاوت کی (ایسی) کئی دستاویزیں اور مسلیں موجود ہیں۔

بغاوت کے 'قابل قدر' ریکارڈ کے بارے میں ڈاکٹر سین نے خصوصیت سے بتایا ہے کہ نیشنل لائبریری کلکتہ کے ذخیرے میں 1857ء کے اخباروں کے تراشوں کا ایک مجموعہ موجود ہے۔ (باب: 11، صفحہ: 421)

اس مجموعے کی بھی، جس سے نہ صرف اس زمانے کے فعال اخباروں کے نام اور رپورٹنگ کے پختہ احوال میسر آ سکتے ہیں، کوئی فہرست ابھی تک سامنے نہیں آئی۔ اسی ایک حوالے سے ڈاکٹر سین کی کاوش کے نا تمام ہونے اور 1857ء کی تاریخ نگاری میں عصری اخباروں کو نظر انداز کرنے کا انجام معلوم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سین کی 'کتابیات' کے ابتدائی چار صفحات رموز سے لبریز ہیں۔ ان چار صفحات کے بین السطور سے پتہ چلتا ہے کہ 1857 کی تصویر کے سارے نقوش برطانیہ کے انگریزی زبان کے ضابطہ بند

سرکاری ریکارڈ پر ختم نہیں ہونے چاہئیں اور ڈاکٹر سین کے 'دیباچے' اور 'کتابیات' کے دقیق اور تشنہ حوالوں کی آسودگی ہونا ضروری ہے۔ حیرت ہے کہ سرکاری سطح کی تیسری گولڈن جوبلی کی تقریب تک اس مزاحمتی تشنگی اور محرومی پر عبور نہیں پایا جاسکا۔ ظاہر ہے کہ اس ضرورت کی بارآوری فارسی اور اردو کے ماہروں کی مدد ہی سے بخوبی ہوسکتی ہے۔

اس ضمن میں حکومت مغربی بنگال کا فرض اولین ہے۔ اسے اس ریکارڈ کی برآمدگی، فہرست سازی اور مناسب وضاحت کے ضروری اقدام کرنا چاہئیں۔ اگر وہ اکیلے اپنی اردو اکادمی کی مدد سے یہ کام نہ کرسکے تو اسے مرکزی حکومت کی مدد لینی چاہیے جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) کی وساطت سے اسے مکمل کرسکتی ہے۔

کتاب کے 'دیباچہ' میں ڈاکٹر سین نے اپنے انداز سے بہت سی باتیں کہی ہیں، جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

> ''بغاوت کی تحقیق کے لیے جو اساسی میٹریل (مواد) دیا گیا وہ ایک تو یک طرفہ تھا۔ دوسرے نہایت ضخیم تھا۔ مجھے یہ کام 1955ء کے اوائل میں اس ہدایت کے ساتھ دیا گیا کہ اس کی قابل اشاعت کاپی 31 جون 1956ء تک حکومت کو مل جانا چاہیے۔''

ڈاکٹر سین نے مزید کہا کہ برطانیہ اور ہندوستان دونوں جگہوں پر یہ موضوع تحفظات اور تعصّبات میں گھرا ہوا ہے۔ بہرحال حکومت ہند کا رویہ بہت لبرل رہا جس سے اس کام کو ہاتھ میں لینے کی میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ مزید (1857ء کی صداقت جاننے کے لیے) ہر جگہ پر لوگوں کا رویہ معتدل ہو رہا ہے۔ بہرحال اس تالیف کو مستند نگارش تصور نہیں کیا جانا چاہیے۔ (صفحہ xxix تا xxxi)

دراصل 1857ء کی تاریخ میں اس دور کے عوام اور ان کے ذہن پر متاثر ہونے والی صحافت کا حصہ بہت معتد بہ تھا لیکن برطانیہ کے سامراجی ریکارڈ میں اس شہادت کو غالباً دانستہ اوجھل رکھا گیا کیونکہ کمپنی کے حکام اس احتجاجی تحریک کو ہمیشہ 'غدر' اور اپنی سپاہ کی نافرمانی کا معاملہ تصور کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے (جبری) اقتدار کے بارے

میں عوام کا حقیقی اور فطری رویہ جاننے یا اس پر واجب توجہ دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔

کتاب میں حکومت ہند کے ایک اور منتخبہ محقق اور تنقید نگار رودرانشو مکھرجی کا 'تعارف' (Introduction) بھی ہے۔ منجملہ دیگر نکات کے انھوں نے کہا ہے:

> ''اگر کوئی قاری ڈاکٹر سین کی بغاوت کی اس تاریخ میں بغاوت کے شرکاء کی سرگرمیوں (خیالات اور لائحۂ عمل) کے بارے میں کوئی مواد تلاش کرنے کی کوشش کرے تو ایسی کوشش عبث ہوگی۔'' (صفحہ: iv)

ڈاکٹر سین کی کتاب سے متعلق مذکورہ حوالے راقم الحروف کے اس تصور کی وضاحت میں عرض کئے گئے ہیں کہ 1857ء کی حقیقی اور سیر حاصل تاریخ نگاری ابھی تک نہیں ہوئی۔ معصوم مرادآبادی کی زیر نظر کتاب ایک اچھی ابتدا ہے لیکن یہ اوران کی طرح دوسرے محقق بغاوت کے شافی مواد کی محدودیت اور اس محدودیت پر عبور پانے کے محالات سے سپر انداز ہوجاتے ہیں لیکن حصول آزادی کے بعد جب اس مقفل ریکارڈ کی چابیاں مل گئیں، آزاد ہند کی پہلے مرکزی کابینہ کے ایک برگزیدہ وزیر کی باضابطہ کاوش کے تعلق سے اس اہمیت کی طہارت ضرور نمایاں ہوگئی۔

بہرحال اس بغاوت کے مشن کی آواز حصول آزادی سے قبل بھی کم از کم اردو صحافی نہ صرف سنتے رہے بلکہ 1857ء کے نامکمل کام کو مکمل کرنے کے منصوبے بھی بناتے رہے۔ یہاں میں پہلی گولڈن جوبلی (1907ء) کا ذکر کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اسے غیر منقسم پنجاب کی راجدھانی لاہور کے اس زمانے کے قریب آدھے درجن مقبول اخباروں کے صحافیوں نے جان و مال کی قربانیاں دے کر منایا۔ اس صف میں اخباروں کے اڈیٹر، کالم نگار اور رضا کار ادیب شامل تھے۔ اس کی تفصیل حقیر راقم الحروف کی کتاب 'اردو صحافت کا سفر' میں دی گئی ہے۔ مختصراً اسی گروپ میں ہفت روزہ 'ہندوستان' کے ناشر اڈیٹر دینا ناتھ ہفت روزہ 'انڈیا' گوجرانوالہ کے اڈیٹر پنڈی داس، پندرہ روزہ 'جھنگ سیال' کے اڈیٹر دین دیال بانکے، ہفت روزہ 'پیشوا' کے اڈیٹر ضیاء الحق۔ لالہ لاجپت رائے کے ہفت روزہ 'پنجابی' کے اڈیٹر جسونت

سنگھ، 'ہندوستان' کے ادارتی معاون صوفی انبا پرشاد، 'ایڈورڈ گزٹ' کے سابق اڈیٹر کرتار سنگھ، کالم نگار کشن سنگھ (والد شہید بھگت سنگھ)، اجیت سنگھ (چچا شہید بھگت سنگھ)، شاعر و پمفلٹ نگار لال چند فلک اور دیگر شامل تھے۔

یہ سبھا فروری 1907ء میں لاہور میں سیکولر بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ اس کے پروگرام میں دیگر امور کے علاوہ فرنگی حکومت کے ضابطوں کی پرامن مزاحمت، برطانوی اشیاء کا بائیکاٹ اور سودیشی اشیاء کا استعمال شامل تھے۔ بنگال کے نوجوان انقلابی ابوالکلام آزاد، جن کی صحافت اور سیاسیات کی شہرت دن بدن بڑھ رہی تھی، اس سبھا کے سرگرم معاون تھے۔ اس گروہ کے کچھ ممبروں نے بنگال کی تقسیم کے برطانوی اعلان کے بعد ہونے والے انڈین نیشنل کانگریس کے 1906ء کے کلکتہ اجلاس میں شرکت کی تھی۔ وہاں بنگال کی تقسیم کے حوالے سے برطانوی راج کے خلاف ایک انقلابی تحریک چلانے کا عزم کیا گیا۔ پنجاب کے ان صحافیوں نے اس عزم کو اپنے انداز سے اختیار کیا اور 1857ء کے فرنگی کے اخراج کے ادھورے کام کو مکمل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے لیے جو فوری طور پر بھارت ماتا سبھا کے قیام میں ڈھل گیا اور جو تحریک آزادی کا نیا راستہ تھا۔ انھوں نے نوجوان انقلابی لیڈر لالہ لاجپت رائے اور دیسی افواج کے ایک طبقے کی حمایت حاصل کرلی تھی۔ اس مشق کے لیے انھوں نے ہر مشکل اور ہر قربانی برداشت کرنے کا عزم کیا۔ ان کا ایک اخبار 'سوراجیہ' کے نام سے الٰہ آباد سے نکلا جس کے اڈیٹر کی اعلانیہ 'تنخواہ' جو کی ایک روٹی اور پانی کا ایک پیالہ تھی۔ یکے بعد دیگرے اس لاثانی اخبار کے نو اڈیٹروں نے بغاوت کے جرم میں سنگین مقدموں، گرفتاریوں اور کالے پانی کی انسانیت سوز صعوبتیں جھیلیں۔

اس سبھا کی پراسرار سرگرمیوں سے بیسویں صدی کے اوائل ہی میں پنجاب میں تحریک آزادی اور سیاسی حرارت کی وہ رو چلی جس کے بعد ہی 'وطن'، 'زمیندار'، 'پرتاپ'، 'ملاپ'، 'بندے ماترم'، 'انقلاب' اور دیگر مشہور اردو اخباروں کا اضافہ ہوا۔

''فرنگی حکومت کی مسلسل نالش اور ایذا رسانی نے سبھا کو زندہ نہ رہنے

دیا۔اس کے باوجود اس تحریک کی بدولت لاہور اردو اخباروں کا عظیم
انقلابی مرکز بن گیا اور اردو اخباروں کو ایک منفرد مرتبہ اور وقار مل گیا۔
اس دور کے بڑے بڑے لیڈر، اسکالر اور ادیب اپنے خیالات اردو
اخباروں میں چھپوانے کے راستے ہموار کرتے رہے۔''

(گربچن چندن: اردو صحافت کا سفر، 2007ء، صفحہ: 89 تا 105)

یہ سب اس زبان کی عمومیت کا فیض تھا جو اس کے بانیوں نے اسے گھٹی میں پلائی تھی۔ 1857ء کے معرکے میں بھی اس زبان کی آزاد منشی اور وسیع المشربی فعال رہیں۔اس دور کے اہم ترین اور بغاوت کے روز اول سے اس کے مخلص مشاہد 'دہلی اردو اخبار' کے عالم دین اڈیٹر مولوی محمد باقر نے بغاوت کے پہلے ہی ماہ کے ایک شمارے میں اس کے ہندو مسلم ''دلیران تلنگان کو بھیم وارجن اور حضرت صاحب قِران کے تیمور گاں'' کا حوالہ دے کر یکساں انداز سے ان کا حوصلہ بڑھایا۔

فرنگی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تقسیم پسند حکام نے بغاوت کے محاذ کا ہندو مسلم اتحاد توڑنے کے لیے اس کے ابتدائی ایام ہی میں جامع مسجد دہلی کے مختلف اطراف اور دیگر اہم مقامات پر اردو زبان میں ایک عوامی اشتہار لگوادیا تھا جس میں یہ تو اعتراف کیا گیا کہ سرکاری سپاہ کو دیے جانے والے نئے کارتوسوں میں چربی لگائی گئی تھی لیکن ''یہ چربی (صرف) گاؤ کی تھی۔اس لیے مسلمان سپاہ نہ صرف ہندو باغیوں سے الگ ہوجائیں بلکہ ہمارے شریک ہوکر اہل ہنود کو قتل کریں۔''

اس اشتہار کی نقل 'دہلی اردو اخبار' نے چھاپی لیکن غالباً یہ تمام محققوں کے سامنے نہیں آئی۔اس کے سیاق میں اگر زبان، منطق اور اس کے لگوانے والے کمپنی حکام کی ذہنیت غور سے دیکھی جائیں تو 1857ء کی بغاوت کو فروغ دینے والوں کی راستی بالکل واضح ہوجائے گی اور جو لوگ اردو کے مواخذ کے بغیر بغاوت کی مکمل کہانی پیش کرنا چاہتے ہیں انھیں اپنی بے زری کا علم ہوجائے گا۔سب جانتے ہیں کہ بغاوت کی ابتدائی کامیابی کا راز اس کے ہندو مسلم باغیوں کے اتحاد میں تھا۔کمپنی کے حکام اپنی ریشہ

دوانیوں اور رشوت سازی سے اسے توڑنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے۔ یہ حکام اپنا اقتدار قائم کرنے کے خود پسند مقصد پر بضد رہے اور بغاوت کے امکان سے وابستہ ہر دشواری اور رکاوٹ سے بچاؤ کرتے رہے۔ اس بچاؤ کے لیے انھوں نے اورنگ زیب کے کمزور جانشینوں کے اختیارات اپنے حق میں منتقل کرنے کے لیے اپنے تجارتی معاہدے سے ماوراطرح طرح کی سیاسی تدبیریں کیں۔ اِدھر اُدھر کے کسی جھگڑے یا تصادم میں طاقت کے زور سے موثر مداخلت کے بعد مغل نمائندوں سے جو معاہدے کیے ان کے حتمی متن ایسے طے کیے جن سے ان کی بالادستی قائم ہو اور حسب موقع سیاسی حیثیت بارآور ہو۔ پھر جب چربی آمیز نجس کارتوسوں کے استعمال کے خلاف ان کی سپاہ نے ایک جائز احتجاج کیا تو انھوں نے فرعونی عجلت سے اسے مسترد کر دیا۔ یہ بغاوت 10 مئی 1857ء کو ان کی چھاؤنی میرٹھ میں شروع ہوئی اور کمپنی حکام کے تحکمانہ انکار سے زور پکڑ گئی۔ باغی سپاہ کے جوکھم بھرے ردّعمل کے باوجود کمپنی کسی دانا یا مدبر کی طرح اپنے اعمال پر نظر ڈالنے کی روادار نہ تھی۔ اس کے برعکس نزاعی کارتوسوں کے استعمال کے اصرار پر اس کا رویہ خاصا اشتعال انگیز تھا۔ اس نے اپنی شاکی اور دکھی سپاہ کو مجبور کیا کہ وہ کوئی اور قدم اٹھائیں۔

کمپنی کو ہر لمحہ اپنا خودساختہ سامراج مقدم اور عزیز تھا۔ کوئی موقع ہو، معاملہ ہو، ملاقات ہو، اس کے حکام ہر بات اور ہر گزارش کو اپنے سامراج کی باٹ میں تولتے تھے۔ کارتوسوں کا معاملہ ایک جاریہ شکوے کا نیا مرحلہ تھا لیکن کمپنی کے حکام نے اپنے دکھی سپاہ کو صرف ڈانٹ ڈپٹ سے نمٹانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی سپاہ کو انسانی جذبے یا محسوسات کی آمد و رفت کا حامل نہ مانا۔ اپنی خود بینی میں کمپنی کے حکام کو یہ زعم رہا کہ کوئی ان کا دامن نہیں پکڑ سکتا اور ہندوستان کے لوگ ہر موقع پر ان کی ہدایت اور رہبری کے محتاج ہیں۔

شاکی سپاہ کو مجبوراً بغاوت کا راستہ لینا پڑا۔ وہ 10 رمئی کی رات بھر سفر کرتے ہوئے 11 رمئی کی صبح کو دہلی پہنچتے ہی مغل تاجدارِ وقت کے حضور میں گئے۔ ان کے سالار

نے حضرت کی خدمت میں کمپنی حکام کی رعونت اور نجس کارتوسوں کے جبری استعمال کی شکایت کی اور مزاج فرسا فرنگی اقتدار سے نجات پانے کی اپنی مہم کے لیے ان کی قیادت مانگی۔ یہ ایک ستم زدہ فریق کی فریاد تھی لیکن کمپنی سرکار کے معاہدوں کے سائے میں پڑے حضور بادشاہ کی خودمختاری ان کے پاس نہ تھی۔

لال قلعے کے شاہی روزنامچے 'سراج الاخبار' کے مطابق بادشاہ نے ان کی فریاد سننے کے بعد فوراً جواب دیا:

> ''سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ لگائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت تو (میرے آبائی) بادشاہوں کے ہمراہ گئی ...... میری سلطنت برسوں پہلے گھر سے جا چکی تھی ...... میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا، (وہ) قوت لایموت کو محتاج ہو گئے ...... میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مجھے ستانے کیوں آئے ہو؟ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں۔ میرے پاس کوئی ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمہیں نوکر رکھوں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھ سے کسی طرح توقع استطاعت کی نہ رکھو۔''

(بحوالہ: اسلم پرویز: بہادر شاہ اور اٹھارہ سو ستاون، سہ ماہی 'اردو ادب' نئی دہلی خصوصی شمارہ، اکتوبر تا دسمبر 2007ء، صفحہ: 97 اور 98)

ظاہر ہے کہ آمدہ باغی دستے کو بہادر شاہ کے اختیارات کی اس محرومی اور بے بسی کا کوئی علم نہیں تھا۔ انھیں اس وقت قائد انقلاب بنانا ایک علت خام تھی۔ آج بھی انھیں قائد انقلاب تصور کرنا سراسر ایک زیادتی اور بے فیض خطابت ہے۔ باغی سپاہ کا دستہ تو معروف مغل نظامِ سلطنت کے وارث تاجدار سے بڑی خوش امیدی سے اپنی مہم کی توثیق اور امداد کے لیے گیا تھا۔ اسے امورِ شاہان کی حقیقتوں کا علم ہی نہیں تھا۔

کمپنی سرکار اپنی سیاسی سرگرمیوں کو مشتہر نہیں کرتی تھی اور مغل حکومت سے اپنے

سیاسی معاملوں اور معاہدوں کو صیغہ راز میں رکھتی تھی۔ گو ان کی دھونس سے وہ مغل وارثان تخت پر رعونت سے آقا بن کر سوار رہتی تھی۔

میرٹھ کے جیالے باغیوں اور مجاہدین حریت کو غالباً یہ معلوم ہی نہ تھا کہ سابق کمپنی حکام نے بہادر شاہ ثانی کے دادا شاہ عالم ثانی (1759ء تا 1806ء) سے بکسر کے مقام پر ایک جنگ (1764ء) جیت کر 26 لاکھ روپے کی فیس کے عوض ملک کے تین صوبوں (بنگال، بہار اور اڑیسہ) کے دیوانی حقوق حاصل کر لینے کا معاہدہ کر رکھا تھا اور اسی اجازت کو نیابت کی واجبی سطح پر رکھنے کے بجائے آپا دھاپی سے اپنے پیٹے میں ڈال لیا تھا۔ شاہ عالم موصوف کے بعد مغل تخت کے وارث اکبر شاہ دوم (1806ء تا 1857ء) کو کمپنی کے آقاؤں نے لال قلعہ (قلعہ معلیٰ) سے ان کی رہائش منتقل کروانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

دیوانی حقوق غصب کرنے کے بعد فرنگی کمپنی اپنی دھونس سے ملک کے سیاہ وسفید کی مالک بن گئی تھی۔ مغل حکومت کے وارثانِ تخت کمپنی کی حقیر پنشن پر چلتے رہے جس کی ادائیگی میں کمپنی کی نیت اور زیرکی شامل رہتی تھی۔ اسی زیرکی سے انھوں نے معاہدہ بکسر کے پانچ سال بعد شاہ عالم ثانی کو 26 لاکھ روپے کی تسلیم شدہ فیس دینا بند کر دی تھی۔ مغل وارثان ناتوانی سے یہ خفت اٹھاتے رہے۔

ڈپلومیسی آشنا آمریت کا یہ ایک عجیب نظام تھا جس کی پڑتال اور سرزنش کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ مغل اقتدار اپنی تاریخ کے سیاق میں عام لوگوں کے لیے ایک نقرئی کرن کی مانند تھا لیکن کمپنی کے سلسلہ وار ڈائرکٹروں نے بڑی یک دلی سے اپنے پہلے گورنر لارڈ کلائیو کے تصور کو کبھی فراموش نہ کیا جس نے اورنگ زیب کی وفات کے بعد پہلے پلاسی (1757ء) اور پھر بکسر (1764ء) کی جنگیں جیت کر ایک سازگار زمین تیار کر دی تھی۔ 1757ء کے زخم خنداں کا حتمی چرکہ 1858ء میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ثانی کی اس جلاوطنی کے ساتھ واقع ہوا جس سے نہ صرف زندہ بہادر شاہ کی ذات بلکہ ان کی میّت بھی بے وطن ہوگئی۔ اپنی دانست کے مطابق مغل سلطنت کا حساب بے باق

کرنے میں کمپنی اس قدر مستعد تھی کہ ہفت روزہ 'کوہ نور' لاہور کے مطابق (جس کی مزید متعلقہ خبریں نیچے پیش کی جارہی ہیں) اس کے ذمہ داران نے بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی اور نظر بندی کے دوران دسمبر 1860ء میں ''تخت شاہ سابق 'دہلی' اپنے صدر مقام کلکتہ منگوا کر 15 / دسمبر 1860ء کو بذریعہ بحری جہاز 'سیلڈ ن' (انگلینڈ) بجھوادیا۔''

(مالک رام: تحقیقی مضامین، ہفتہ وار 'کوہ نور، لاہور، صفحہ: 208)

بہادر شاہ دوم نے اپنی بے چارگی کا اظہار میرٹھ سے آنے والے بظاہر نجات دہند باغیوں کے سامنے کیا لیکن یہ باغی اپنی کشتیاں جلا چکے تھے۔ بہادر شاہ کی قیادت ہو یا نہ ہو انھیں فرنگی غلبے سے نجات پانے کے سوا اب کچھ اور سوجھتا ہی نہیں تھا۔ یہ ایک نفسیاتی الجھن تھی جس پر انھوں نے اپنی ہمت اور دلاوری سے سبقت پائی۔ انھوں نے حالات کو منشائے الٰہی مانتے ہوئے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ طاقتور فرنگی حکومت کا جسے ابتدائی ہفتوں میں انھوں نے اپنی مسند سے گرادیا تھا، فاتحہ تو نہ پڑھ سکے لیکن انھوں نے کمپنی کی مورث برطانوی حکومت کو قائل اور مائل ضرور کردیا کہ وہ اپنی ایجنسی کا نظامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی نااہلی کو تسلیم کرے۔ یہ پیش قدمی بھی باغی سپاہ اور ان کے ہم رکاب دوسرے مجاہدین آزادی کی دلاوری اور مستعدی کی توصیف تھی جن کی مستقل یادآوری 1857ء کی عظمت کی تاریخی پہچان ہے۔

1857ء کی اولین جنگ آزادی کی کوئی موقر تاریخ ان گمنام باغیوں اور شہیدوں کی اہمیت کو نظر انداز یا نیچا نہیں کرسکتی۔ انھوں نے فقط اپنے جذبہ وطن سے کمال سرفروشی اور جانبازی سے وقت کی آزمائش کو بے خطر قبول کیا۔ ان کا بے لوث ایثار رہتی دنیا تک خدمت ملک کی روشن ترین نظیر کے طور پر نہ صرف تاریخ ہند بلکہ تاریخ عالم کے اوراق پر ثبت رہے گا۔

11 / مئی 1857ء کو بہادر شاہ ظفر نے ان کی فریاد سن کر اپنی بے چارگی کے ساتھ اپنی جانباز ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ 'سراج الاخبار' کی ایک اور رپورٹ میں جو اس کے 23 / مئی 1857ء کے شمارے، میں چھپی، حسب ذیل بیان ملتا ہے:

''ہمارے پاس مال وخزانہ نہیں جس سے تمہاری مدد کریں۔ ایک جان
ہے، اس سے دریغ نہیں...... (آپ کو) میگزین اور خزانے کا
بندوبست کرنا چاہیے تاکہ ہمارے تمہارے کام آسکے۔''

(سہ ماہی 'اردو ادب' نئی دہلی، خصوصی شمارہ، ایضاً: صفحہ: 101)

ترک سواروں نے اس بیان میں مضمر اشارے کو گرہ باندھا اور چست و چوبند ہو گئے لیکن کمپنی کے اس راج میں باغیوں کے لیے شاہ کی جان کی یہ پیش کش بھی عبث تھی۔ کمپنی نے بغاوت پر قابو پاتے ہی اپنی فوجی عدالت میں بہادر شاہ پر غداری کا ایک سنگین مقدمہ دائر کر دیا تھا جس کی سزا میں حضرت کو کمپنی کے ایک مقبوضہ علاقے رنگون میں جلاوطن اور نظر بند کر دیا گیا تھا جہاں انھیں، اوران کے ساتھی شاہی قیدیوں کے لیے صرف -/631 روپے کا ماہانہ گزارہ الاؤنس مقرر کیا گیا تھا۔ (مالک رام: تحقیقی مضامین، ایضاً، صفحہ: 208) چار سال بعد جب سسک سسک کر وہاں ان کی وفات ہوگئی تو ان کی لاش کو بھی واپس وطن نہیں آنے دیا گیا تھا۔

کمپنی کے نام نہاد معاہدوں کے تلے مغل وارث بہادر شاہ کی بے چارگی ایک طرف ان کی حکومت کے عملے اور کنبے کی حیثیت بھی دردناک تھی۔ ان کی کیفیت کے احوال 'اخبار الحقائق' 19 ر دسمبر 1854ء کی حسب ذیل رپورٹوں میں پیش کیے جاتے ہیں جو ہماری تاریخوں میں عام طور پر نہیں ملتے۔

''اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ جن دنوں میں نواب لارڈ الن براصاحب
بہادر ہند کے گورنر جنرل تھے، انھوں نے شاہ جم جاہ دہلی سے ملاقات
چاہی تھی اور یہ تمنا کی تھی کہ (وہ) دربار میں بادشاہ کے برابر چوکی پر
بیٹھیں۔ مگر جب حضرت سلطانی سے یہ امر نامنظور ہوا، تب نواب
ممدوح نے تحریر کر کے نذرانہ سالانہ جو سرکار فیضِ مدار انگریزی سے مقرر
تھا، بند کروا دیا۔ اب بندگانِ شاہی چاہتے ہیں کہ اس سال کے آخر
تک اس مقدمہ میں حکام ولایت سے سلسلہ جنبانی کریں، لیکن

صاحب مہتمم 'ہرکارہ' اخبار کی یہ رائے ہے کہ بادشاہ سلامت اس باب میں ناحق کو زیر بار نہ ہوں اور تکلیف نہ کریں۔''

(مالک رام: تحقیقی مضامین، صفحہ: 230، کوہِ نور، 19 ستمبر 1854ء)

ملاحظہ کیجئے کہ دیوانی حقوق کو اپنا اختیار واحد بنا لینے کے بعد کمپنی راج میں چھپنے والی اس خبر کی عبارت، انگریز گورنر جنرل کے لیے مغلوں کی مصدقہ لقب 'نواب' کا استعمال، مغل وارث بہادر شاہ ظفر کا دانہ پانی اٹھا لینے کی مجال اور حکام ولایت کے سامنے حضور بادشاہ کی فریاد کی بے اثری ٹیک ٹیک کر مغل درگت کو عیاں کر رہی ہے۔

'خبر دہلی'

اخبارات سے معلوم ہوا کہ سلاطین دہلی نے درخواست اضافہ معاش معینہ کی گورنمنٹ میں کی تھی۔ کیوں کہ بہ سبب گزشتہ سلاطین، بیگمات کے پنشن اونکی فی الجملہ پہلے سے بہت کم ہے۔ مگر گورنمنٹ سے درخواست ان کی نامنظور ہوئی اور حکم صادر ہوا کہ وہ اپنا گذارہ نوکری سے، خواہ کسی پیشہ سے کریں اور علاوہ اس کے، کیونکہ قلعہ دہلی میں بہ سبب کثرت خاندانِ شاہی و متعلقین کے بہت ہجوم رہتا ہے اور مکانات کی کشمکش، سلاطینِ موصوف آیندہ سے قطب صاحب میں رہا کریں گے اور میر فخرو بھی بعد تخت نشینی کے قطب صاحب ہی میں رونق افروز رہا کریں گے۔''

('کوہ نور' 5 دسمبر 1854ء بحوالہ مالک رام: تحقیقی مضامین، صفحہ: 229)

یہاں بھی ملاحظہ کیجئے کہ بہادر شاہ ثانی کا شاہی خاندان تعداد کی کثرت، جگہ کی تنگی اور گزر اوقات کی قلت سب میں بری طرح مبتلا تھا اور اپنے نان و نفقے کے لیے کمپنی کی طرف دیکھتا تھا۔ کمپنی ان کی مدد کرنا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔ مغل خاندان کا معزز وارث کمپنی سے مزید خرچے کی درخواست کے عوض ڈانٹ ڈپٹ کھاتا تھا۔ تنگ دستی، تنگ اقامتی اور تنگ آبروئی اس کا مقدر ہو گئی تھی اور بہادر شاہ کے لیے اپنے روزمرہ میں بہتری ناممکنات میں تھی۔

'خبر دہلی'

اخبار 'انڈین اسٹنڈرڈ' سے معلوم ہوا کہ ایک واردات عظیم قتل سنگین کی قلعہ معلیٰ دہلی میں وقوع میں آئی۔ یعنی ایک بیگم صاحبہ نے کسی کنیز خورد سال کو ہلاک کیا۔ صاحب خبر لکھتے ہیں کہ اس واردات کی تفصیل بڑی حیرت افزا ہے مگر اس قدر معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ اس کنیز سے کسی باعث سے بہت خفا ہو گئیں اور بہ عالم غضب نا کی ایک سلاخ آہنی گرم کرا کر اوس کے جسم میں گھوسیڑ دی اور اس کو نہایت بے دردی سے مارا۔ بعد اوس کے ایک چادر میں اس کے جسم کو لپٹوا کر گھر سے پھینکوا دیا کہ اس حالت میں سسکتی ہوئی کنیز مذکور پائی گئی۔ صرف اظہار لینے تک زندہ رہی، بعد ازاں مرگئی۔ اب علاقہ دہلی کے ایجنٹی میں روبکار ہے اور صاحب اجنٹ گورنر جنرل نے گورنمنٹ کو رپورٹ کی ہے۔ سابق میں جو سزا ایک شہزادہ کو بہ علتِ قتل اپنی زوجہ کے ملی تھی، اوس کو شاید اہل قلعہ بھول گئے تھے۔ اب دیکھئے اس مقدمہ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ حکام عہد اچھی طرح انصاف کریں گے۔ اب حضرت شاہِ دہلی بہت ضعیف ہیں اور وزرا ان کے مرتشی۔ پس معاملات فوجداری میں مغل سرکار انگریزی کا خواہ مخواہ لازم آیا، تا کہ امن جان و مال کا ہو جاوے۔

('کوہِ نور'، 6/مارچ 1858ء بحوالہ مالک رام: تحقیقی مضامین، صفحہ:230)

یہاں پھر ملاحظہ کیجئے کہ اس وقت کے انگریزی اخبار لال قلعہ میں مغل شاہی خاندان کے افراد کی نجی زندگی پر کتنی تیز نظر رکھتے تھے۔ مغل تاجدار کے لال قلعہ کے اپنے نجی ماحول میں بھی کوئی خصوصی حقوق نہیں تھے اور کمپنی کا گورنر جنرل ان پر پولیس کمشنر کا حکم رکھتا تھا۔ یہ خبر تو ایک بیگم کی گھریلو ملازمہ کی تھی۔ اس سے قبل ایک شہزادہ اپنی زوجہ کے قتل کے جرم میں کمپنی سرکار کی سزا پا چکا تھا۔

یہ سب خبریں 1857ء سے قریب تین سال قبل کی ہیں۔ خبروں کے ابتدائی

سال 1854ء سے بغاوت کے سال 1857ء تک مغل بادشاہ کے صبح و شام کیسے گزرے ہوں گے ان کا اندازہ کرنا دشوار نہ ہوگا۔ 11 رمئی 1857ء کو اپنے دیوانِ خاص میں آنے والے میرٹھ کے باغی دستے کو ان کے جواب کا لب ولہجہ کسی حکمراں کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ 'کوہِ نور' کی مندرجہ بالا رپورٹوں کے سیاق میں وہ اپنی ذات کے اندر معذور اور شکستہ خاطر نظر آتے تھے۔ اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مجبوری کی پشت پر کمپنی کی سنگلاخ سیاست تھی۔

تاریخ کے اس عظیم اور المناک کردار کی ایک اور دستاویزی تصویر ڈاکٹر ایس این سین کی انگریزی تالیف '1857' میں ملتی ہے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر سین غالباً ہمارے واحد تاریخ دان ہیں جنھیں 1857ء کی جنگ حریت کا سارا ضابطہ بند ریکارڈ مصدقہ طور پر پیش کیا گیا جس کا علاقہ بہ علاقہ بیان انھوں نے اپنی نادر تالیف میں درج کیا۔ بہادر شاہ کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''دہلی میں ایک بادشاہ رہتا تھا۔ اس کی کوئی بادشاہت نہیں تھی مگر ان کے ہاں ان کے آباء واجداد کی سلطنت کی یاد رقص کرتی رہتی تھی۔ اس کی رہائش لال قلعے میں تھی اور اس کا اقتدار بھی اس قلعے کے اندر ہی محدود تھا۔ یہ اقتدار بھی غیر پابند نہیں تھا۔ اس پر برطانوی نگرانی حاوی تھی۔ اس کے لیے یہ مان لیا گیا تھا کہ اس کے مرتبے کا پاس ولحاظ ماضی کے روایتی طور پر کیا جائے۔ سو ان کا ٹھاٹ باٹ تو تھا لیکن اس کے نیچے حقائق کی زمین نہ تھی۔ اس کے گزر اوقات کے لیے پنشن کی ایک رقم مقرر تھی جسے ان کے درباری (کمپنی کا) خراج اور ہدیہ بیان کرتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ برطانیہ کی ناز برداری سے وہ ایک شاہی مرتبے کا مالک تھا اور باہر کا عام آدمی بھی یہ باور کرتا تھا کہ قلعے کے اندر ہندوستان کا شہنشاہ بیٹھا ہے جو بابر اور اکبر کے خاندان کا سلسلہ وار اور قانونی جانشین ہے۔''

(سریندر ناتھ سین: 1857، تیسرا اڈیشن، 1995ء، نئی دہلی، صفحہ: 64)

ڈاکٹر سین کی کاوش سراسر برطانیہ کے ضابطے کے ریکارڈ پر مبنی ہے اور بہادر شاہ کے اس تعارف میں بھی برطانوی کمپنی کا رنگ ڈھنگ ضرور فعال رہا ہوگا۔ گو یہ رنگ ڈھنگ ان کے اپنے روزنامچہ اور 'کوہ نور' کی متذکرہ خبروں کا ہم خو ہے۔

افسوس اور قلق یہ ہے کہ ڈاکٹر سین کو کمپنی کے فارسی اور اردو کے اس ریکارڈ کے مشمولات کی تشریحات کیوں نہ دی گئیں جو فرنگی کمپنی ترجموں سے بچتی ہوئی بستوں میں باندھ کر چھوڑ گئی تھی۔ اس اعتبار سے مولانا آزاد مرحوم کا کام جو بھارت سرکار ہی نے شروع کروایا تھا، ناتمام ہے۔ اس کی شکایت خود مولف نے تالیف کے آغاز اور بعد میں بھی کی ہے۔ لہٰذا سرکاری سطح پر اس قومی کام کو ترجیحی طور پر جلد از جلد ہاتھ میں لیا جانا چاہیے بالخصوص ڈاکٹر سین کے بتائے ہوئے نیشنل لائبریری کلکتہ کے عصری اخباروں کے تراشوں کے مجموعے پر فوری اور مناسب توجہ دی جانی چاہیے۔ اس کے لیے اگر فارسی اور اردو کے ماہرین کی ضرورت ہو تو اس کی تکمیل میں کسی تاخیر یا بخل کو بیچ میں نہیں لانا چاہیے۔

معصوم صاحب ایک مستند اور کہنہ مشق نوجوان صحافی ہیں۔ وہ ہندوستان کی اردو صحافت کے بارے میں ایک بڑا ترقی پسند اور تعمیری نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے ایک ایسے موضوع کو پیش کیا ہے جو ہماری تاریخ میں بہت نظر انداز کیا گیا ہے اور جس پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے لیکن یہ کام تحقیق اور دریافت کا ہے۔ انھوں نے اپنی حد تک تو اس کام کو ایک منزل تک پہنچا دیا ہے لیکن اب بھی اس باب میں بڑی گنجائش ہے۔ ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

گربچن چندن

جی 46 جنگ پورہ ایکس ٹینشن، نئی دہلی-110014

5رمئی 2008ء

اردو صحافت اور 1857

1857 میں انگریزوں کے خلاف پھوٹنے والی فوجی بغاوت کا فوری سبب اگرچہ چربی والے کارتوسوں کا واقعہ تھا جس نے دیسی سپاہ میں انگریزی حکومت کے خلاف نفرت اور بغاوت کے جذبات برانگیختہ کردیئے تھے لیکن اس تحریک کو جو عوامی حمایت اور ہمہ گیری حاصل ہوئی اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی عوام غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے کتنے بے تاب تھے اور ان کے اندر سرفروشی کے جذبات کس حد تک موجزن تھے۔ بعد کے برطانوی مورخین نے جنگ آزادی 1857 کی اہمیت اور طاقت کو کم کرنے کی خاطر اسے ایک ناکام فوجی بغاوت کہہ کر درگزر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن دراصل اس شورش نے انگریزی حکومت کی چولیں ہلا دی تھیں۔تلمیذ خلدون کے الفاظ میں:

> ''برطانوی مورخین کا بلند بانگ دعویٰ کہ 1857 کا انقلاب صرف ایک فوجی بغاوت تھی، حقیقت کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بغاوت پھوٹنے کے چند ہی ہفتوں کے اندر شمالی ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا نام ونشان مٹنے میں تھوڑی سی ہی کسر باقی رہ گئی تھی۔''(1)

10 مئی کو میرٹھ سے پھوٹنے والی بغاوت کی چنگاریاں جس تیزی کے ساتھ پورے ہندوستان میں پھیلیں اس سے انگریزوں کے پاؤں کس حد تک اکھڑ گئے تھے اس کا اندازہ تھامپسن لو کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے:

''اب ہندوستان میں رہنا گویا اس آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑا ہونا ہے جس کے کنارے ٹوٹ پھوٹ کر ہمارے پیروں کے نیچے سے سرک رہے ہوں اور کھولتا ہوا لاوا پھوٹنے اور ہمیں بھسم کر دینے والا ہو۔''(2)

بغاوت کا فوری سبب دیسی سپاہیوں میں اس خبر کا پھیل جانا تھا کہ انھیں استعمال کے لیے جو رائفلیں دی گئی ہیں ان کے کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی کی آمیزش ہے۔ان کارتوسوں کو استعمال سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا لہٰذا اس خبر سے ہندو اور مسلمان سپاہیوں میں اپنے مذہبی جذبات کی توہین کے زیر اثر کمال درجے کا اشتعال اور غم وغصہ پھیل جانا ایک فطری عمل تھا۔ چربی والے کارتوسوں کے خلاف دیسی سپاہ میں نفرت اور بغاوت کا لاوا پھوٹ نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس بغاوت نے ایک ہمہ گیر سیلاب کا روپ اختیار کر لیا۔تھامپسن لو کے مطابق:

''دختر کش راجپوت، کٹر برہمن، متعصب مسلمان اور عیش پسند توند والا، من چلا مرہٹہ سبھی اس جہاد میں شامل ہو گئے۔گائے کا قاتل اور گائے کا پجاری، خنزیر سے کراہیت رکھنے والا اور خنزیر کا گوشت کھانے والا، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھنے والا اور برہمہ کے منتروں کو گنگنانے والا سبھی نے مل کر بغاوت کی۔''(3)

عوامی غم وغصہ کا طوفان کس درجہ شدید تھا اس کا اندازہ مذکورہ اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے اور اس سے یہ بھی عیاں ہے کہ نفرت کا یہ لاوا جب پھوٹا تو ہندوستان کے ہر طبقہ ہر مکتب فکر، مذہب اور عقیدے کا آدمی انجام کی پروا کیے بغیر آتش نمرود میں کود پڑا۔ بادشاہ سے لے کر عام آدمی تک ہر ایک اس جہاد میں شامل ہو گیا اور اردو صحافت نے اس جہاد میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔اردو زبان کے ایک عاشق گارساں دتاسی نے جو کہ مذہباً عیسائی تھے،اس صورت حال کی عکاسی ان لفظوں میں کی ہے:

''ان منحوس کارتوسوں کی تقسیم کے موقع پر ہندوستانی اخبارات نے جو بددلی پھیلانے والوں کے آلہ کار تھے،اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اہل

ہندو کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار پر اکسایا اور یہ باور کروایا کہ اس حیلے سے انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے تھے۔''(4)

اس ذیل میں عتیق صدیقی کا بیان، اس دور کی اخبار نویسی کے مزاج کو واضح کرتا ہے:

''ہندوستانی اخبار نویسی کی ابتدائی تاریخ کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستانی اخبار نویسی کا مزاج ابتداء ہی سے باغیانہ تھا۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستانیوں نے فارسی، بنگلہ، اردو، ہندی اور انگریزی اخبار جاری کرنا شروع کئے۔ یہ سیدھے سادے معصوم سے اخلاقی اخبار ہوتے تھے۔ ان میں خبریں بھی ہوتی تھیں مگر بہ ظاہر غیر سیاسی قسم کی، لیکن ان کے انداز بیان اور ان کے مواد کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کی گہرائی میں غم وغصہ کے دبے ہوئے طوفان نظر آئیں گے۔''(5)

1857 کی جنگ آزادی کا مرکز ومحور ہندوستان کا پایۂ تخت دہلی تھا۔ اس لئے دہلی سے شائع ہونے والے اس دور کے اردو اخبارات نے سب سے آگے بڑھ کر سرفروشانہ کردار ادا کیا۔ اگرچہ ان اخبارات کی تعداد اشاعت محدود تھی لیکن ان کے قارئین بااثر طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جنگ آزادی 1857 کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانے میں اردو صحافت نے جو قائدانہ کردار ادا کیا اس کو 1857 کے ایک مستند مورخ سید خورشید مصطفےٰ رضوی نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

''اگر صرف دہلی کے اخبارات پر نظر ڈالیں تو ان میں انقلابی جذبات کا دریا موجزن دکھائی دے گا۔ دہلی سے بغاوت کے دوران چند اخبارات خاص طور پر نمایاں تھے۔ مثلاً 'دہلی اردو اخبار'، 'صادق الاخبار'، 'سراج الاخبار' (فارسی) وغیرہ۔ 'دہلی اردو اخبار'، جولائی 1857 میں 'اخبار الظفر' کے نام سے نکلا۔ 'سراج الاخبار' فارسی میں تھا اور بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے کی حیثیت رکھتا تھا۔''(6)

اخبارات اور سرکاری پالیسی

برطانوی حکومت ابتداء میں یہ چاہتی تھی کہ اخبارات کو فروغ حاصل ہو اور زیادہ سے زیادہ اخبارات و جرائد کا اجراء ہوتا کہ عوام کے ذہن کو نئی روشنی ملے۔ اسی لئے اس دور میں جو سرکاری رپورٹیں منظر عام پر آئیں ان میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ اخبار سیاسی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتے اور عوام کی شکایات منظر عام پر نہیں لاتے۔ 1857 میں شائع شدہ ایک رپورٹ میں یہ شکایت کی گئی کہ اخبارات رائے عامہ کے رجحانات ظاہر نہیں کرتے اور ان کے اڈیٹر سیاسی مسائل پر بحث میں اتنے محتاط ہیں کہ وہ رائے عامہ کے اظہار سے بھی احتراز کرتے ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایک طرف تو حکومت اخبارات کا فروغ چاہتی تھی اور دوسری طرف وہ آزادیٔ صحافت سے بھی خوف کھاتی تھی۔ 1835 کے بعد اصولی اور قانونی طور پر تو صحافت کو آزادی حاصل تھی لیکن عملی طور پر اس کو حکومت کا پابند بنا کر رکھا گیا تھا۔ زیادہ تر اخبارات حکومت کی طرف سے دی ہوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ امداد پر انحصار رکھتے تھے اور جنھیں امداد میسر نہیں تھی وہ اس کی امید پر قلم کو روک کر چلاتے تھے۔ دوسری طرف اجنبی حکومت کی مجموعی دہشت ایسی تھی کہ کسی کو بے باک ہو کر حکومت کی کارکردگی پر تنقید کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ نٹراجن کے اس بیان سے ہوتا ہے:

> ''معاشرتی فضا بظاہر ایسی تھی کہ دہلی اور لکھنؤ کی اردو زبان کے محاورے کی ایک دوسرے پر برتری اور ہندوؤں میں نکاح بیوگان کے مسئلہ پر اظہار رائے بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔'' (7)

قابل ذکر ہے کہ اس مسموم فضا میں بھی بعض اخبارات ایسے موجود تھے جو کبھی کبھی بے باکی کے ساتھ عوامی رائے کی ترجمانی کا فریضہ انجام دینے کا جوکھم اٹھاتے تھے۔ مثال کے طور پر 'دہلی اردو اخبار' نے کمپنی کے ہندوستانی ملازمین کے حق میں آواز بلند کی اور پولیس افسران پر جس انداز میں نکتہ چینی کی وہ قابل تحسین ہے۔ اسی طرح 'کوہ نور' لاہور اگرچہ کمپنی کا ہم نوا تھا لیکن اس نے بھی بسا اوقات بے باکی اور جرأت کا مظاہرہ

کیا۔ مثال کے طور پر اس نے ہندوستان بھر کے اخبار نویسوں سے اپیل کی کہ وہ آزادیٔ صحافت کو برقرار رکھنے کے لیے یک دل اور ایک رائے ہوکر کام کریں۔ 'کوہ نور' نے اس موقع پر اودھ میں برطانوی نظم و نسق پر بھی سخت نکتہ چینی کی۔ اس طرح لکھنؤ کے اخبارات نے اس انارکی اور معاشی بدحالی کو بے نقاب کیا جو اودھ کے الحاق کے بعد لکھنؤ میں رونما ہوئی۔ یہ ایسی مثالیں ہیں جن میں کمپنی کے طریقہ کار اور طرز حکومت پر تنقید اور نکتہ چینی بہت واضح انداز میں ہوئی۔

1857 سے چند ماہ پیشتر اور 1857 کے آغاز میں اردو اخبارات کا لہجہ خاصا تلخ و ترش ہو گیا تھا اور وہ آنے والے انقلاب کی آہٹ محسوس کرنے لگے تھے۔ 'طلسم' لکھنؤ کی ایک خبر ملاحظہ ہو:

> ''اخبار انگلش مین مطبوعہ 12 دسمبر 1856 سے معلوم ہوا کہ اطاعت کا قرینہ زمانے سے معدوم ہوا۔ ان دنوں جتنے راجہ ہیں، سب نے بالاتفاق چٹھی اس مضمون کی تحریر کی ہے۔ جرأت کی تقریر کی ہے کہ جو سرکاری کمپنی کے خلاف عہود و مواثیق رؤسا سے ہندوستان کی ریاست بجبر لیتی ہے (اس سے) ایک تو خلقت بیکاری سے مرتی ہے۔ دوسرے بسی بسائی بستیاں سرکار ویران کئے دیتی ہے۔ اس باعث سے ہم لوگوں نے باہم ہر ایک کو فساد پر آمادہ کیا ہے۔ ہمارا ملک اگر لیں گے تو جان دینے کا ارادہ کیا ہے۔ خلاف عہد و پیماں اگر ریاست لینے پر سرکار کو اصرار ہے تو یہاں بھی سرِ میدان ہر ایک جان دینے کو تیار ہے۔ جس دم معرکۂ کارزار کی گرم بازاری ہوگی، دیکھ لینا کیسی ذلت و خواری ہوگی۔ پادشاہ اولوالعزم کو پاس تحریر اور خیال تقریر ضروری ہے۔ بدعہدی میں ہلڑ مچے گا۔ ایک عالم مستعد فتور ہے۔ گویوں کی زبان بند رہتی ہے۔ راست بازوں سے خلق خدا رضامند رہتی ہے۔'' (8)

اعلان جہاد

1857 کے اوائل میں انگریزوں کے خلاف جو خبریں اخبارات کی زینت بن رہی تھیں ان سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اخبارات انگریزوں کے خلاف جہاد چھیڑنے کے لیے کمر بستہ ہو چکے تھے اور وہ ان کی تباہی و بربادی کی امید پر اپنے قارئین کو متحرک اور سرگرم کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ اس کی ایک مثال دہلی سے شائع ہونے والے 'خلاصۃ الاخبار' کے 13 اپریل 1857 کے شمارے سے دی جا سکتی ہے۔

> ''چند روز ہوئے کہ جامع مسجد کی دیوار پر ایک اعلان چسپاں کیا گیا تھا۔ اس پر ایک تلوار اور ڈھال کی شکل بنی ہوئی تھی اور یہ اعلان شاہ ایران کے پاس سے آیا ہوا بتاتے تھے۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ تمام سچے مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ کمر بستہ ہو کر شاہ ایران کی اعانت کریں اور وفاداری سے اس کی حکومت و اختیار کو ملحوظ رکھیں اور انگریزوں سے جہاد کریں تا کہ انھیں تباہ و برباد کر کے اس کی عنایات کے مورد ہوں۔ انعامات و خطابات حاصل کریں جو شاہ ایران فراخدلی سے عطا کرے گا۔ پھر اعلان میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ شاہ ایران یا جمشید ثانی بہت جلد ہندوستان آئے گا اور اس ملک کو خود مختار بنا دے گا۔ محرر اخبار ان تمام باتوں کو خرافات اور حمق پر مبنی سمجھتا ہے کیونکہ اگر ممالک حکومتوں کے ہاتھ سے یوں ہی نکل جایا کریں تو فوجوں کا کیا فائدہ۔'' (9)

'خلاصۃ الاخبار' کی اس خبر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اخبار نے اپنے قارئین تک اپنا پیغام پہنچانے کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ہی آخر میں اپنے بچاؤ کے لیے چند جملے تحریر کئے ہیں۔ جامع مسجد کی دیوار پر چسپاں کئے گئے اس اعلان کو اخبار میں نقل کرنا بھی بڑی جرأت کا کام تھا جس میں واضح طور پر انگریزوں کے خلاف جہاد چھیڑنے اور انھیں تباہ و برباد کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ اخبارات کی نکتہ چینی کے اس انداز پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے کہ:

''نکتہ چینی کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ پہلے نظم ونسق پر سخت الفاظ میں تنقید اور پھر آخری چند فقروں میں برطانوی راج کی مدح میں چند باتیں کہہ دیں جو روغن قاز کی حیثیت رکھتی تھیں۔'' (10)

خبروں کے ذرائع

اردو صحافت کو اپنی ابتداء میں وسائل کی شدید قلت کے علاوہ خبروں کی فراہمی میں مشکلات درپیش تھیں۔ 1857 تک اردو اخباروں کی خبروں کا بڑا ذریعہ وہ قلمی اخبارات تھے جو مختلف درباروں سے وابستہ سرکاری وقائع نگار مرتب کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آزاد وقائع نگاروں کے مرتب کئے ہوئے خبرنامے اس میں خاص کردار ادا کرتے تھے کیونکہ ایسے آزاد وقائع نگاروں کی اس دور میں بہت کثرت تھی۔ تمام اخبارات کے پاس اپنا رپورٹنگ نیٹ ورک موجود نہیں تھا۔ اسی لیے وہ سب سے زیادہ آزاد وقائع نگاروں کی مرتب کردہ خبروں پر انحصار کرتے تھے۔

اردو اخباروں کا دوسرا بڑا ذریعہ اس دور کے انگریزی اخبار تھے جو کمپنی کی حکومت کے مکمل طور پر ہمنوا ہوا کرتے تھے۔ ان اخبارات سے اکثر غیر ملکی اور بعض ملکی خبریں منتخب کرکے ترجمہ کروا کے شائع کی جاتی تھیں۔ اس دور میں صرف 'کوہ نور' لاہور واحد اردو اخبار تھا جس کا ایک نامہ نگار ہرات (افغانستان) میں مقیم تھا جو تھوڑے عرصہ کے بعد فارسی زبان میں اپنا مکتوب بھیجتا تھا اور اسے جوں کا توں اردو اخباروں میں نقل کردیا جاتا تھا کیونکہ اس زمانے میں اردو اخبارات کے قارئین فارسی سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے کہ وہی اردو کی پیش رو صحافت تھی۔ خبروں کا تیسرا بڑا ذریعہ ان اخبارات کے اپنے اعزازی نامہ نگار تھے جو بغیر کسی معاوضہ کے خبریں فراہم کرتے تھے جبکہ چوتھا ذریعہ ہم عصر اردو اور فارسی اخبارات تھے کیونکہ اس دور میں اخبارات ایک دوسرے کی خبریں کثرت سے نقل کرتے تھے۔ ہر اخبار دوسرے اخبارات سے اپنے قارئین کی دلچسپی کی خبریں منتخب کرکے انھیں حوالے کے ساتھ اپنے اخبار میں نقل کردیتا تھا۔ اس طرح جو

قاری کوئی ایک اچھا اردو اخبار خریدتا تھا وہ خود بخود سارے معیاری فارسی اور اردو اخبارات کی دلچسپ خبروں سے آشنا ہو جاتا تھا۔ قابل ذکر ہے کہ اس دور میں ذرائع ابلاغ نے اس درجہ ترقی نہیں کی تھی، اس لیے اس دور کے انگریزی اخبارات نے خبر رسانی کے جو ذرائع اختیار کئے تھے، وہ بھی اسی سے ملتے جلتے تھے تاہم انھیں وسائل کی قلت کا اس طرح سامنا نہیں تھا جس طرح اردو اخبارات کو درپیش تھا۔

صحافت کو صدمہ

جنگ آزادی 1857 میں اردو صحافت نے جو سرفروشانہ کردار ادا کیا، اس کا سب سے زیادہ خمیازہ بھی اسے ہی بھگتنا پڑا۔ تختہ دار پر بھی حق گوئی کا جوکھم اٹھانے کی سزا اردو صحافت کو یہ ملی کہ اسے اپنے ارتقائی دور میں ہی زبردست صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اردو صحافت نے اپنی ابتداء میں وسائل کی قلت اور مسائل کے انبار کے باوجود تیزی کے ساتھ ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔ ملک کے دور دراز علاقوں سے تیزی کے ساتھ اردو اخبارات نکلنے شروع ہوئے۔ خبر رسانی اور عوامی ذہنوں کو بیدار کرنے کے علاوہ اردو زبان کے فروغ اور رائے عامہ کی ترجمانی میں بھی ان اخبارات نے بھرپور حصہ لیا۔

انقلاب 1857 کے نتائج اور عواقب نے صرف اردو اخبارات ہی کو زیر نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو عملاً صحافت سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس بے دخلی کی وجہ یہ تھی کہ اس انقلاب میں وہی سب سے آگے تھے اور اس دور کے اقتدار پرست انگریزی اخبارات مسلسل ان کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم چلا رہے تھے۔

1857 کی جنگ چھڑتے ہی شمالی مغربی صوبہ جات کے زیادہ تر اردو اخبارات بند ہو گئے۔ ان کی جگہ نئے اخبارات نکل آئے۔ اردو اخبارات کی اشاعت اور توسیع کو پہنچنے والے نقصان کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1853 میں اردو زبان کے اخبارات کی تعداد 35 تھی جو کہ 1858 کی فہرست میں گھٹ کر صرف 12 رہ گئی۔ ان میں 6 پچھلے اخبارات تھے اور 6 نئے۔ ان 12 اخبارات میں صرف ایک اخبار کی

ادارت کسی مسلمان کے سپرد تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ قانون زباں بندی (Gagging Act) کے تحت زیادہ تر کارروائی فارسی اور اردو اخباروں کے خلاف ہوئی۔ دیگر دیسی زبانوں میں کوئی اخبار زیر عتاب نہیں آیا کیونکہ انقلاب کو کامیاب بنانے میں قلعہ معلیٰ اور اردو صحافت کے درمیان غیر معمولی ہم آہنگی قائم تھی۔

1857 کی بغاوت کے بعد انگریزوں نے اردو صحافت کو ملیامیٹ کرنے کے لیے تمام حربے اختیار کئے اور وہ مسلسل ان کوششوں میں مصروف رہے کہ کسی طرح باغیانہ جذبات کی تخم ریزی کرنے والی اس آواز کو دبا دیا جائے لیکن اردو اخبارات مسلسل اپنے فرض منصبی کو نبھاتے رہے اور انھوں نے آزمائش کے اس دور میں ذرا بھی غفلت اور پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ بقول گربچن چندن:

> ''1857 کی بغاوت کے بعد غیر ملکی حکومت نے دیسی اخبارات پر نت نئی پابندیاں عائد کیں اور اس جبر و استبداد سے جھوجھتی ہوئی یہ صحافت بڑی ہمت اور تمکنت سے بیسویں صدی میں داخل ہوئی۔ اس کے دل و دماغ میں وطن پرور سیاست اور آزادی کا حوصلہ تھا۔ اس کی سوچ اور زبان بالعموم عوام کی تمناؤں کا آئینہ تھی۔ اس کے قلم کاروں میں حریت پسند اور ایثار پیشہ دانشور تھے جن کے خلوص اور جذبہ انتساب نے اردو صحافت کو اپنے حلقوں سے باہر بھی محترم اور محبوب بنادیا۔'' (11)

اردو صحافت کو اپنی ابتدا میں ہی جن سنگین حالات سے دوچار ہونا پڑا وہ نہایت سخت اور صبر آزما تھے۔ جنگ آزادی 1857 کے دوران بیشتر اخبارات نے فرنگیوں کے خلاف مزاحمت اور احتجاج کا رخ اپنایا اور وہ فریضہ ادا کیا جو بے باک صحافت کی پہچان ہے لیکن اپنی ابتداء میں ابتلا سے دوچار ہونے کے سبب اردو صحافت کو بھاری نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ اول ان حالات کے پیش نظر اپنی ابتداء میں اردو اخبارات نے مزاحمت اور احتجاج کی جو روش اختیار کی تھی وہ ملک کی آزادی (1947) تک نہ صرف جاری رہی بلکہ اس میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف لڑنے کی ایک ایسی صفت پیدا ہوگئی جو

کسی اور زبان کی صحافت کا طرۂ امتیاز نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اردو صحافت پر اس کا ایک منفی اثر بھی پڑا یعنی مزاحمت اور احتجاج کی روش مستقل طور پر اردو صحافت کے مزاج کا حصہ بن گئی اور آج بھی اردو صحافت کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ وہ ظلم، ناانصافی کے خلاف ہونے والی ہر لڑائی میں پیش پیش نظر آتی ہے۔ اسی لئے بعض حلقوں کی طرف سے آج بھی اردو صحافت پر 'ردعمل کی صحافت' ہونے کا لیبل چسپاں کیا جاتا ہے۔

طاہر مسعود نے 1857 کی جنگ آزادی میں اردو اخبارات کو پہنچنے والے نقصان پر بحث کرتے ہوئے تفصیلی روشنی ڈالی ہے:

''اردو صحافت کو پہلا زبردست صدمہ 1857 کی جنگ آزادی میں پہنچا۔ ہر چند کہ اس جنگ میں اردو اخبارات نے نہایت بے باکی سے مجاہدین آزادی کا ساتھ دیا۔ اخبار نویسوں نے فرنگی راج کے خاتمے کے لئے اپنے قلم کو ہتھیار بنا لیا۔ 'دہلی اردو اخبار'، 'صادق الاخبار' اور 'فتح الاخبار' وغیرہ نے مجاہدانہ انداز میں مجاہدین آزادی کے حوصلے بڑھائے۔ یقیناً ان میں سے بعض سرکار پرست اخبارات بھی تھے۔ جیسے 'کوہ نور' اور 'نور الابصار' وغیرہ، تاہم بہ حیثیت مجموعی اردو صحافت نے جنگ آزادی میں قوم پرستانہ کردار ادا کیا۔ جنگ آزادی کی ناکامی نے اردو صحافت کے مستقبل کو بھی بہ ظاہر تاریک کر دیا۔ وہ تمام شہر جو اردو صحافت کے اہم مراکز تھے مثلاً دہلی، لکھنؤ، میرٹھ، کانپور وغیرہ انقلاب کے بھی مراکز تھے۔ لہٰذا انقلاب کی ناکامی کے بعد ان شہروں پر جو ستم ڈھائے گئے اس میں ایک ستم یہ بھی ہوا کہ ان شہروں سے اردو صحافت کا صفایا ہو گیا۔'' (12)

1857 کی پہلی جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے دہلی کے اخبارات میں ایک مماثلت پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان تمام اخبارات کی سرگرمیوں کا محور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر ہی تھے۔ انگریزوں نے اقتدار مغلوں کے ہاتھوں

سے چھینا تھا اور بہادر شاہ ظفر کی زندگی مظلوم ہندوستانیوں کے لئے امید کی ایک کرن جیسی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کا مجموعی رویہ حسن سلوک اور انسان دوستی سے عبارت تھا۔ وہ مغل حکمرانوں میں دوسروں سے کہیں زیادہ نرم دل اور رعایا پرور ثابت ہوئے تھے۔ انگریزوں کے ظلم وستم، لوٹ کھسوٹ اور جابرانہ طریقہ کار سے عاجز لوگ امید کر رہے تھے کہ مغلیہ سلطنت کا سورج ایک بار پھر طلوع ہوگا اور بوڑھے بہادر شاہ ظفر ہی ملک کے فرماں روا قرار پائیں گے۔

1857 کے دوران جرأت مندانہ کردار ادا کرنے والے اخبارات بہادر شاہ ظفر سے نظریاتی طور پر جڑے ہوئے تھے۔ اس دور کے اہم اخبارات میں 'سراج الاخبار' تو خود قلعہ معلّٰی کا ہی ترجمان تھا جبکہ 'دہلی اردو اخبار' کے مدیر مولوی محمد باقر، بہادر شاہ ظفر سے عقیدت مندی کا تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے بادشاہ کے حکم سے ہی بعد کے زمانے میں 'دہلی اردو اخبار' کا نام بدل کر 'اخبار الظفر' کر دیا تھا۔ اس ضمن میں جری کردار ادا کرنے والا اخبار 'پیام آزادی' بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا بیدار بخت نے بادشاہ کے حکم سے جاری کیا تھا۔ اس دور کا چوتھا اخبار 'صادق الاخبار' بہادر شاہ ظفر کے مشہور زمانہ مقدمے میں زیر بحث آیا۔ اردو صحافت کے شاندار انقلابی کردار ہی کی وجہ سے بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں وکیل استغاثہ نے اردو صحافت پر قلعہ معلّٰی سے سازش کا الزام عائد کیا۔

حوالے

1۔ 'انقلاب 1857'، مرتبہ: پی سی جوشی، صفحہ:4

2۔ لو: بحوالہ تصنیف صفحہ:59، بحوالہ 'انقلاب 1857'، صفحہ:29

3۔ تصنیف لو، صفحہ:326 بحوالہ 'انقلاب 1857'، مرتبہ: پی سی جوشی، صفحہ:3

4۔ گارساں دتاسی: 'خطبات' جلد اول، صفحہ:218

5۔ 'ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں'، صفحہ:359

6۔ خورشید مصطفےٰ رضوی: 'تاریخ جنگ آزادی 1857'، صفحہ:344

7۔ J. Natrajan: History of Indian Journalism, Page: 65

8۔ 'طلسم' لکھنؤ، 16 جنوری 1857

9۔ 'خلاصۃ الاخبار'، دہلی 13 اپریل 1857

10۔ 'صحافت پاکستان و ہند میں'، صفحہ:156

11۔ گربچن چندن: 'اردو صحافت پر ایک نظر'، صفحہ:10

12۔ 'اردو صحافت انیسویں صدی میں'، صفحہ:1083

تعارف

کسی بھی زبان کی صحافت اپنے عہد کا سب سے شفاف آئینہ ہوتی ہے۔ اخبارات ہی روزمرہ کی اچھی اور بری سرگرمیوں کا گوشوارہ تیار کرتے ہیں جس سے ہمیں اس عہد کے رجحانات اور شخصیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جنگ آزادی 1857 کی تاریخ کا اصل ریکارڈ اور ماخذ یا تو اس وقت کے سرکاری دستاویزات ہیں یا پھر وہ اخبارات ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں سے انگریز سامراج کے سامنے سب سے بڑا چیلنج کھڑا کردیا تھا۔ بغاوت کی وہ لہر جو میرٹھ سے شروع ہوکر دہلی پہنچی تھی اس کی چنگاری کو شعلہ بنانے میں اردو صحافت نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ہر چند کہ یہ اردو صحافت کا ابتدائی دور تھا اور ابھی پوری طرح اس کے بال و پر بھی نہیں نکلے تھے لیکن اس ابتدائی دور میں بھی اردو صحافت نے بے باکی اور جرأت کا ایسا پرچم بلند کیا کہ انگریزوں کو اپنے اقتدار کی بنیادیں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

13/ جون 1857 کو جابرانہ ایکٹ (Gagging Act) کو جاری کرتے ہوئے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے قانون ساز کونسل کے سامنے جو تقریر کی وہ انگریز حکمرانوں کی پریشانی کو اجاگر کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ”مجھے شک ہے کہ گزشتہ چند ہفتوں کے دوران دیسی پریس کے ذریعہ خفیہ اطلاعات کے نام پر پھیلائی گئی افواہوں کے نتیجے میں ہندوستان کی مقامی آبادی کے دلوں میں بغاوت کی آگ جس بے ہودہ حد تک

بھڑکائی گئی ہے اس کو اچھی طرح سمجھا اور پہچانا گیا ہے۔ یہ کام ثابت قدمی، ہوشیاری اور فنکاری سے کیا گیا ہے۔ حقائق کو مسخ کرنے کے علاوہ گورنمنٹ کو بدنام کرنے اور اس کے مقاصد کو غلط رنگ میں پیش کرنے اور اس کی رعیت میں بے چینی اور منافرت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی گئی ہے۔''(1)

جنگ آزادی 1857 کی سرگرمیوں کا محور و مرکز ہندوستان کا پایۂ تخت دہلی تھا۔ اس لئے اس دور کی سرگرمیوں کی تفصیلات ہمیں سب سے زیادہ دہلی کے اخبارات سے ہی ملتی ہیں۔ اگر چہ لاہور، آگرہ اور لکھنؤ کے اخبارات بھی اس جنگ کی خبریں شائع کرنے میں پیش پیش تھے لیکن دہلی کے اخبارات سب سے زیادہ سبقت لئے ہوئے تھے۔

یوں تو اردو صحافت کا آغاز 1822 میں کلکتہ سے 'جامِ جہاں نما' کی اشاعت کے ساتھ ہو چکا تھا لیکن دہلی میں اردو صحافت کی ابتداء 1837 میں 'دہلی اردو اخبار' سے ہوئی جو مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے جاری کیا تھا۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران دہلی میں اسی اخبار نے سب سے زیادہ انقلابی رجحانات کو فروغ دینے کا کام کیا۔ 1857 کی بغاوت کی رپورٹنگ اور اس عہد کے واقعات کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کی پاداش میں اس پر انگریزوں کا عتاب نازل ہوا اور مولوی محمد باقر کو گرفتار کر کے نہایت سفاکی سے شہید کر دیا گیا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ مولوی محمد باقر وطنِ عزیز کی آزادی پر اپنی جان نثار کرنے والے اولین صحافی ہیں اور ہندوستان میں کسی بھی زبان کی صحافت اس قربانی کی کوئی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ ہمارا ہی سرمایۂ افتخار ہے کہ قلم کی آبرو اور وطن کی سرخروئی کے لیے ہندوستان کی تاریخ میں اپنی جان قربان کرنے والا پہلا صحافی اسی اردو زبان ہی نے پیدا کیا جس کی کوکھ سے انقلاب کے لازوال نعرے نے جنم لیا تھا۔ اردو صحافت کی پیدائش بھی انقلاب کے بطن سے ہوئی اور اس میں آج بھی پچھلے زمانے کا وہ بانکپن اور جرأت اظہار بدرجہ اتم موجود ہے۔ اردو صحافت ایک بڑے مشن اور مقصد کے تحت وجود میں آئی تھی اور یہ آج بھی

ایک پروفیشن سے زیادہ مشن کا درجہ رکھتی ہے۔ڈاکٹر طاہر مسعود نے لکھا ہے:

''اردو صحافت نے استعمار کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی اور انگریزی نظام حکومت اور سیاست کے زیر سایہ پروان چڑھ رہی تھی۔ تاہم اس کی جڑوں میں باغیانہ رجحانات کی تخم ریزی ہوچکی تھی۔ اپنی پیش رو فارسی صحافت سے اس نے انگریز راج پر تنقید واحتساب کے آداب سیکھ لیے تھے چنانچہ دور اول کے اردو اخبارات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ ان اخبارات نے عام طور پر محتاط ہونے کے باوجود کمپنی کی حکومت سے کہیں کھلم کھلا اور کہیں ڈھکے چھپے الفاظ میں بیزاری کا اظہار تواتر سے کیا۔ کمپنی حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں عام ہندوستانی کی سوچ کیا ہے اور وہ اجنبی حکمرانوں کے بارے میں کیا احساسات رکھتا ہے۔ان اخباروں میں اس کی عکاسی ہوتی رہی تھی۔'' (2)

مطبوعہ صحافت کے آغاز سے پہلے ہی قلمی اخبارات انگریزوں کے خلاف عوام کے ذہنوں کو تیار کرنے کا کام کررہے تھے اور انھوں نے برطانوی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا شروع کردیا تھا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آرک لینڈ (1836-1842) کے رکن قانون لارڈ میکالے نے 1836 میں اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

''یہ اخبارات مرتب کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے جو ہر کچہری اور دیسی راجوں کے درباروں کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ دہلی کے شاہی محل اور ریزیڈینسی کے مقامات پر بیس تا تیس وقائع نگار موجود رہتے ہیں۔ دہلی سے ہر روز جو قلمی اخبارات باہر بھیجے جاتے ہیں ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہیں ہوسکتی لیکن جانکار حلقوں کا اندازہ ہے کہ یہ 120 ہیں۔ان اخباروں میں اکثر حکومت اور اس کے ملازمین کو رسوا کیا جاتا ہے اور ہمارے برطانوی کردار پر پھبتیاں اڑائی جاتی ہیں۔'' (3)

اس حقیقت کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ بظاہر معمولی تعداد اشاعت والے ان قلمی اخبارات کی دسترس عام لوگوں کے ذہن وشعور تک تھی اور یہ نہایت خاموشی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والی چنگاریوں کو ہوا دینے کا کام پوری مستعدی اور جرأت کے ساتھ کررہے تھے۔ 1857 کے انقلاب کے دو سال بعد 1859 میں پادری لانگ فیلو نے دیسی پریس سے متعلق اپنی رپورٹ میں اعتراف کیا:

> ''دیسی باشندوں کے پریس کو ایسا حفاظتی بند (Safety Valve) سمجھنا چاہئے جو خطرے کی پیشگی خبر دیتا ہے۔ اگر دہلی کے ماہِ جنوری 1857 کے دیسی اخبارات کا مطالعہ یورپین حکام نے کیا ہوتا تو انھیں پتہ چل جاتا کہ دیسی لوگ بغاوت کے لیے کس طرح تیار تھے اور فارس اور روس سے مدد کی امید کررہے تھے۔'' (4)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس دور کے اردو اخبارات مجاہدین کی حوصلہ افزائی اور عوام الناس میں انگریز راج کے خلاف بیداری کی مہم چلانے میں سب سے آگے تھے۔ خاص طور سے دہلی سے شائع ہونے والے اخبارات کے بارے میں مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ:

> ''صادق الاخبار' 'دہلی اردو اخبار' اور 'سراج الاخبار' دہلی میں مجاہدین کے دلیرانہ اور بہادرانہ کارنامے، نمایاں طور پر شائع کئے جاتے تھے اور یہ تینوں اخبار دہلی کے عوام اور مجاہدین آزادی کو پیغامات پہنچانے اور ان کو پامرد بنانے اور انگریزوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کرنے میں پیش پیش تھے۔'' (5)

اردو صحافت نے 1857 کی جنگ آزادی میں جو سرگرم کردار ادا کیا، اسے دیکھ کر انگریز حکمرانوں کو یہ محسوس ہوا کہ اس انقلاب کے برپا ہونے میں دیگر اسباب کے علاوہ قلعہ معلیٰ اور صحافت کے درمیان سازش بھی کارفرما تھی۔ اس سلسلے میں عبدالسلام خورشید نے بہادر شاہ ظفر کے خلاف چلائے جانے والے مقدمے کے

حوالے سے لکھا ہے کہ:

''فوجی عدالت میں وکیل استغاثہ میجر ایف جے ہیریئٹ (Harriot) نے اپنے طویل بیان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ 1857 کا انقلاب جن وجوہ کی بنیاد پر برپا ہوا، اس میں قلعہ معلیٰ اور صحافت کے درمیان سازش بھی کارفرما تھی۔ انقلاب سے پہلے کے اخباری اقتباسات کا حوالہ دیتے ہوئے وکیل استغاثہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اخبارات نے آنے والے انقلاب کے لئے زمین تیار کی۔ مثلاً 'صادق الاخبار' نے جنوری کے مہینے میں یہ خبر درج کی کہ روس اور ترکی انگریزوں کے خلاف جنگ میں ایران کی مدد کریں گے اور شہنشاہ روس نے چار لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج اس مہم کے لئے تیار کی ہے۔ اسی اخبار نے بتایا کہ شاہ ایران نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کون کون سے درباری کو ممبئی، کلکتہ اور پونہ کی گورنری سونپی جائے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ بہادر شاہ ہندوستان بھر کا بادشاہ ہوگا۔ مارچ میں اسی اخبار نے خبر چھاپی کہ ایرانی افسر اور سپاہی ہندوستان میں داخل ہو چکے ہیں اور پانچ سو آفیسر اور سپاہی تو بھیس بدل کر خود دہلی میں موجود ہیں۔ وکیل استغاثہ نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کیا کہ قلعہ معلیٰ اور صحافت کے درمیان کوئی سازش نہیں ہوئی اور جو کچھ ہوا اتفاق سے ہوگیا۔'' (6)

1857 کے دوران مولوی محمد باقر کے 'دہلی اردو اخبار'، جمیل الدین ہجر کے 'صادق الاخبار' اور مرزا بیدار بخت کے 'پیام آزادی' نے جو اہم کردار ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ ان تینوں بنیادی اخبارات کے علاوہ ہم قلعہ معلیٰ سے شائع ہونے والے فارسی اخبار 'سراج الاخبار' کے کردار پر بھی روشنی ڈالیں گے اور اس ذیل میں دہلی سے باہر شائع ہونے والے ان اخبارات کو بھی احاطہ تحریر میں لائیں گے جو 1857 کی جنگ

کے دوران تمام تر خطرات کے باوجود قلم کی آبرو کو بچانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ان میں بعض اخبارات کا رویہ منفی اور انگریز پرست بھی تھا۔

1857 کی جنگ آزادی کا پس منظر بیان کرنے سے پہلے اس دور کی اردو صحافت کے رنگ و آہنگ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

انقلاب 1857 کے دوران سب سے زیادہ جری کردار 'دہلی اردو اخبار' نے ادا کیا۔انقلاب کا آغاز 10 رمئی کو میرٹھ کے سپاہیوں کی بغاوت سے ہوا۔ 11 رمئی کو یہ سپاہی دہلی پہنچے جس کے بعد دہلی شورش و ہنگامے کی لپیٹ میں آ گئی۔ 17 رمئی کو ہفتہ وار 'دہلی اردو اخبار' کا شمارہ منظر عام پر آیا تو اس کے صفحات انقلاب کی خبروں سے لبریز تھے۔ صفحہ اول پر انقلاب کی خبر کا عنوان اور اس کا ابتدائیہ قرآنی آیات سے شروع ہوا تھا۔خبر کا عنوان تھا "قل فاعتبروا یا اولی الابصار" (عبرت ہے دیکھنے والی آنکھ کیلئے) خبر کے آغاز میں جو قرآنی آیات درج تھیں اور بعدازاں اڈیٹر نے اپنی زبان میں جو تمہید باندھی تھی، اس میں خدا کی بزرگی اور برتری کے اعلان اور عزت و ذلت عطا کرنے میں اس کے بے پایاں اور لامحدود اختیارات کے اعتراف کے بعد انسانوں کی غفلت اور گمراہی کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور پھر انگریزوں کی حکومت و طاقت کے خلاف ہونے والے سانحہ عظیم کو موضوع بنایا گیا تھا، ملاحظہ ہو:

> "وہ حکام ظاہر الاستحکام جن کے استقلال حکومت و انتظام کے زوال کا نہ ان کو خیال تھا اور نہ کسی عقال کو وہم و گمان کبھی آ سکتا تھا ایک طرفۃ العین میں وہ نمایاں ہو گیا۔"

اسی طرح 24 رمئی کے شمارے میں شمالی ہندوستان کے کئی دوسرے مقامات اور دہلی کے حالات غدر پیش کئے گئے ہیں۔ان میں کول، بلند شہر، کانپور، لکھنؤ، آگرہ، جھجر، سکندرہ، غازی آباد، بلب گڑھ، میرٹھ رُہتک اور کرنال شامل ہیں۔اسی شمارے میں صفحہ اوّل پر مولوی محمد باقر کے فرزند مولوی محمد حسین آزاد کی نظم 'تاریخ انقلاب عبرت افزا' ملتی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قومِ نصاریٰ
تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاندار
تھی صاحب علم و ہنر و حکمت و فطرت
تھی صاحب جاہ و حشم و لشکر جرار
اللہ ہی اللہ کہ جس وقت کہ نکلے
آفاق میں تیغ غضب حضرت قہار
سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے
سب ناخن تدبیر و خرد ہوگئے بیکار
کام آئی نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو یہیں مار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا
ہے گردش گردوں بھی عجب گردش دوّار

'دہلی اردو اخبار' نے اپنے صفحات پر نہایت ولولہ انگیز تقریریں شائع کیں۔ یہ تقریریں مجاہدین آزادی کے حوصلوں کو مہمیز کرنے والی تھیں۔ ایک ایسی ہی تقریر میں مجاہدین نے کہا تھا:

"یہ معرکہ تمہارا ابھی تواریخوں میں یادرہے گا کہ کس بہادری اور جواں مردی سے تم نے ایسی اولوالعزم اور متکبر سلطنت کے کبروغرور کو توڑا ہے اور ان کی نخوت فرعونی اور غرور شدّادی کو یکسر خاک میں ملا دیا ہے۔ اور ہندوستان کی سلطنت کو جس پر بڑے بڑے بادشاہوں کا دانت تھا اور ان سے (انگریزوں سے) نہ لے سکتے تھے۔ تم نے اون کے قبضۂ اقتدار سے نکال لیا اور رعایائے ہندوستان کو کہ بلائے ناگہانی میں آگئی تھی اس مصیبت سے نجات دی۔" (7)

'دہلی اردو اخبار' کے بعد جس اخبار نے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا وہ

جمیل الدین ہجر کا 'صادق الاخبار' ہے۔ اس اخبار کو 1857 کی جنگ آزادی کے حوالے سے کافی شہرت ملی کیونکہ یہ اخبار انقلاب کی ناکامی کے بعد اس مقدمے میں زیر بحث آیا جو انگریزوں نے قائد انقلاب بہادر شاہ ظفر پر قائم کیا تھا۔ مقدمے کے وکیل استغاثہ نے 'صادق الاخبار' کی خبروں کو اپنے موقف کے ثبوت کے طور پر پیش کیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کے گیارہویں روز (یعنی 9/فروری 1858) کی کارروائی میں ایک قلمی اخبار کے رپورٹر چنی لال پر وکیل سرکار نے جرح کی جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

سوال: کیا دہلی سے کوئی دیسی اخبار نکلتے تھے جن کا منشاء گورنمنٹ برطانیہ کی مخالفت تھا؟

جواب: ایسا ایک پرچہ تھا جمیل الدین کی طرف سے ہفتہ وار شائع ہوتا تھا۔ اس کے مضامین گورنمنٹ سے عداوت ظاہر کرتے تھے اور اسے 'صادق الاخبار' کہتے تھے۔

سوال: کیا یہ پرچہ کثرت سے شائع ہوتا تھا اور چھپا ہوا ہوتا تھا؟

جواب: اس کی تعدادِ اشاعت شہر میں اور شہر کے باہر دوسو تھی اور لیتھو پریس میں طبع ہوتا تھا۔

سوال: کیا یہ پرچہ اپنی ہفتہ وار اشاعت پر اکتفا کرتا تھا یا خبریں بہم پہنچنے پر ضمیمے بھی نکالا کرتا تھا؟

جواب: جی ہاں، غیر معمولی خبریں آنے پر ضمیمہ جات بھی شائع ہوتے تھے۔

سوال: کون اور کس طبقے کے افراد میں اس کی اشاعت زیادہ ہوتی تھی؟

جواب: ہر طبقے میں بلا تخصیص مذہب کے یہ مقبول تھا۔

سوال: اتنے بڑے شہر دہلی کے لیے مقبول عام اخبار کی دوسو کا پیاں تو بہت کم ہیں۔ کیا یہ ہندوستانیوں کے مزاج میں ہے کہ ایک اخبار کئی لوگوں کو سنانے کے لیے خرید لیا جائے۔ اس طرح ایک پرچہ کئی خاندانوں کے لیے کافی ہوتا ہوگا؟

جواب: جی ہاں خریدار پڑھ کر اپنے اپنے پرچے دوستوں اور عزیزوں کو پڑھنے کے

لیے دے دیتے تھے۔

سوال: کیا دہلی میں 'صادق الاخبار' مقتدر آرگن مانا جاتا تھا اور تعداد اشاعت میں دوسرے پرچوں سے بڑھ کر تھا؟

جواب: جی ہاں یہ مقتدر آرگن خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے مضامین نہایت عمدہ اور انگریزی اخبارات کے اقتباسات ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں بہت منظور نظر تھا۔ دیگر اخبارات سے اس کا کثرت اشاعت میں موازنہ تو میں نہیں کر سکتا البتہ وہ بہ نسبت کسی ہندوستانی ہم عصر کے زیادہ طبع ہوتا تھا۔

سوال: تم نے بیان کیا کہ وہ گورنمنٹ برطانیہ سے عداوت رکھتا تھا۔ کیا تمہیں کوئی خاص مضمون یاد ہے جس میں ایسے جذبات کو ظاہر کیا گیا ہو؟

جواب: میں ایسا کوئی خاص مضمون یاد نہیں رکھ سکا جس میں ایسے جذبات کو زیادہ وضاحت سے ظاہر کیا گیا ہو۔ لیکن ایران وروس کے متعلق جو کچھ دیکھا اس میں انگریزوں کے لیے الفاظ سخت برتے ہیں۔(8)

جنگ آزادی کے چھڑتے ہی 'صادق الاخبار' کی حمایت و ہمدردی مغل فرمارو ا بہادر شاہ ظفر سے وابستہ ہوگئی تھی اور اس نے اعلانیہ بادشاہ کی فتح یابی کی نوید دینی شروع کردی تھی۔

عوام کے دلوں میں جذبہ حریت بیدار کرنے میں چربی والے کارتوسوں کا سانحہ ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ 'صادق الاخبار' کے ایک شمارے میں اس واقعہ سے متعلق خبر درج ذیل انداز میں دی گئی ہے۔

''ان دنوں تمام سپاہ سرکار نے نئے نئے کارتوسوں سے سرتابی کرنا شروع کردی ہے چنانچہ چند روز ہوئے کہ علاقہ بنگال میں کچھ پلٹنیں پھر گئی تھیں۔ ایک ان میں سے موقوف ہوئی اور اس کے افسروں کو بھی پھانسی کا حکم ہوا تھا۔ پلٹن گورکھا نمبر 16 مقیم انبالا نے بروقت قواعد عمل درآمد سے انکار کردیا۔ از روئے ایک چٹھی سیالکوٹ کے ظاہر ہوا کہ

یہاں کے سپاہی بھی نئے کارتوسوں کی قواعد سے ٹکراتے ہیں اور بجائے
دانتوں کے ہاتھوں سے کارتوس توڑتے ہیں۔ لوگوں کے دل کا شک
بالکل رفع نہیں ہوا۔'' (9)

'صادق الاخبار' جنگ آزادی میں پیش پیش رہا۔ اس نے اپنی وقیع تحریروں
کے ذریعہ ہندوستانیوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی۔ اخبار عوام وخواص
میں بے حد مقبول تھا۔ 'صادق الاخبار' کے بارے میں عتیق صدیقی رقم طراز ہیں:

''دہلی کا سب سے قابل ذکر اخبار 'صادق الاخبار' ہے جس نے
بغاوت کے جذبات کی تخم ریزی میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا اور
جس نے بغاوت کے دوران باغیوں کے جذبات واحساسات کی
ترجمانی کی تھی۔'' (10)

جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد 'صادق الاخبار' کے اڈیٹر سید جمیل الدین ہجر کو
گرفتار کرلیا گیا۔ ان پر فرد جرم عائد ہوئی کہ انھوں نے سرکار کی بدخواہی میں جھوٹی اور
بے بنیاد خبریں گھڑ کر لکھیں۔

تحریک آزادی میں نئی روح پھونکنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پرچم
تلے جمع کرنے کے سلسلے میں 'پیامِ آزادی' کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔
بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا بیدار بخت کے حکم سے اس کی اشاعت فروری 1857
میں شروع ہوئی تھی۔ 'پیام آزادی' کے پبلشر گو کہ مرزا بیدار بخت تھے لیکن اس کے
خاص نگراں عظیم اللہ خاں تھے جو اس تحریک کے عظیم قائد اور سپہ سالار تھے۔ اسی
زمانے میں بہادر شاہ ظفر کا اعلان آزادی بھی 'پیام آزادی' میں شائع ہوا تھا جس کی
ایک کاپی 'لندن ٹائمز' کے خصوصی نمائندے سر ولیم رسل نے اپنے اخبار کو بھیجی تھی۔

''ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں اٹھو۔ بھائیو اٹھو، خدا نے
انسان کو جتنی برکتیں دی ہیں ان میں سے سب سے زیادہ قیمتی برکت
آزادی کی ہے۔ وہ ظالم فرنگی جس نے دھوکہ سے ہم سے یہ برکت

چھین لی ہے۔ کیا ہمیشہ کے لیے ہمیں اس سے محروم رکھ سکے گا۔"

'پیام آزادی' کے جو شمارے برٹش میوزیم میں 1936 تک محفوظ تھے ان سے پتہ چلتا ہے کہ پیام آزادی کے تیسرے شمارے میں ہندوستان کے بادشاہوں کے اتحاد کے سلسلے میں عظیم اللہ خاں کا ایک بیان شائع ہوا تھا۔ انہی شماروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے اس سب سے پہلے قومی اخبار کی اشاعت فروری 1857 میں شروع ہوئی اور بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا بیدار بخت کے دستخطی پروانے سے یہ شائع ہوتا تھا یعنی موجودہ اصطلاح میں بادشاہ کے حکم سے مرزا بیدار بخت اس اخبار کے اڈیٹر پرنٹر اور پبلشر نامزد کیے گئے تھے۔

1858 میں لندن سے The Narrative of Indian Revolt نامی کتاب شائع ہوئی تھی جس میں 'پیام آزادی' کا ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "بھائیو! دلی میں فرنگیوں کے ساتھ آزادی کی جنگ ہو رہی ہے۔ اللہ کی دعا سے ہم نے انھیں جو پہلی شکست دی ہے اس سے وہ اتنے گھبرا گئے ہیں کہ جتنا کسی دوسرے وقت وہ دس شکستوں سے نہیں گھبرائے۔ بے شمار ہندوستانی بہادر دلی میں آ آ کر جمع ہو رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر آپ وہاں کھانا کھا رہے ہیں تو ہاتھ یہاں آ کر دھوئیے۔ ہمارے کان آپ کی طرف لگے ہیں جس طرح روزہ داروں کے کان مؤذن کی اذان کی طرف لگے رہتے ہیں۔ ہم آپ کی توپوں کی آواز سننے کو بے چین ہیں۔ ہماری آنکھیں آپ کے دیدار کی پیاسی سڑک پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ فوراً آئیے۔"

روہیل کھنڈ کی پلٹنوں سے آزادی کی جنگ میں شامل ہونے کی یہ دردمندانہ اپیل شائع کرنا برطانوی اقتدار کو براہ راست چیلنج کرنا ہی کہا جائے گا۔

'لندن ٹائمز' کے اڈیٹر جان ڈلین کے نام سر ولیم رسل نے جو خط لکھنؤ سے لکھا تھا اس میں 'پیام آزادی' میں شائع بہادر شاہ ظفر کا مذکورہ بالا اعلان بھی منسلک تھا۔ جدوجہد

آزادی کی رپورٹنگ کے لیے لندن ٹائمز نے سر ولیم رسل کو ہی اپنا خصوصی نمائندہ بنا کر ہندوستان بھیجا تھا۔ بادشاہ کا اعلان پیام آزادی میں شائع ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ اخبار جنگ آزادی کا ترجمان بھی کہا جاسکتا ہے۔

'پیام آزادی' کی طاقت ہندو مسلم اتحاد کی طاقت تھی جس سے انگریز اقتدار تلملا گیا تھا۔ سر ہینری کاٹن نے اپنی کتاب Indian and Home Memories میں لکھا ہے کہ انگریزوں نے جب واپس دہلی پر قبضہ پایا تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سبھی لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا جن کے گھروں سے 'پیام آزادی' کا ایک شمارہ بھی برآمد ہوا۔ سب سے دردناک کہانی 'پیام آزادی' کے مدیر بیدار بخت کی ہے۔ سر ولیم ہاورڈ نے اپنی ڈائری کے دوسرے حصے میں لکھا ہے: ''دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد 'پیام آزادی' کے اڈیٹر مرزا بیدار بخت کے جسم پر سور کی چربی مل کر انھیں پھانسی دے دی گئی۔ عوام الناس کی یادداشت میں 'پیام آزادی' میں شائع ہونے والے عظیم اللہ خاں کے متعدد گیت ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے۔ 'پیامِ آزادی' کے اوّلین شمارے میں عظیم اللہ خاں کا جو گیت شائع ہوا تھا اس کا ایک بند اس طرح ہے۔

آیا فرنگی دور سے ایسا منتر مارا
لوٹا دونوں ہاتھوں سے پیارا وطن ہمارا
آج شہیدوں نے تم کو اہل وطن للکارا
توڑو غلامی کی زنجیریں، برساؤ انگارا
ہندو مسلمان، سکھ ہمارا بھائی، بھائی پیارا
یہ ہے آزادی کا جھنڈا اسے سلام ہمارا

اخبار پر پابندیاں

انگریز حکمراں ان دیسی اخبارات سے جن میں بیشتر اردو کے اخبارات تھے، اس درجہ پریشان اور خوفزدہ ہوئے کہ ان کی اشاعت پر قدغن لگانے کے لیے 13/ جون

1857 کو ایک نیا ایکٹ جاری کیا گیا۔ جو Gagging Act کے نام سے مشہور ہے۔
اس جابرانہ ایکٹ کو جاری کرتے ہوئے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے قانون ساز کونسل کے سامنے جو تقریر کی وہ انگریز حکمرانوں کی پریشانی کو اجاگر کرتی ہے۔

"مجھے شک ہے کہ گزشتہ چند ہفتوں کے دوران دیسی پریس کے ذریعہ خفیہ اطلاعات کے نام پر پھیلائی گئی افواہوں کے نتیجے میں ہندوستان کی مقامی آبادی کے دلوں میں بغاوت کی آگ جس بے ہودہ حد تک بھڑکائی گئی ہے اس کو اچھی طرح سمجھا اور پہچانا گیا ہے۔ یہ کام ثابت قدمی، ہوشیاری اور فنکاری سے کیا گیا ہے۔ حقائق کو مسخ کرنے کے علاوہ گورنمنٹ کو بدنام کرنے اور اس کے مقاصد کو غلط رنگ میں پیش کرنے اور اس کی رعیت میں بے چینی اور منافرت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی گئی ہے۔"(11)

لارڈ کیننگ نے ان اخبارات پر بندش لگانے کی تجویز پیش کی اور اظہار رائے کی آزادی کو سلب کرنے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

"ہر مملکت کی زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب کہ بعض ایسی مراعات اور حقوق کو قربان کرنا پڑتا ہے جن کی حفاظت کرنا عام حالات میں حکومت کی ذمہ داری ہے۔ ہندوستان میں آج کل ایسی صورتحال ہے۔ ہمارے اوپر ایسا وقت آ گیا ہے کہ پریس کی آزادی کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آزاد پریس ایک آزاد مملکت کا قدرتی فریضہ معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے جابرانہ حکمرانی کا اور بالخصوص غیر ملکی غلبہ کا مخالف بھی ہوتا ہے جیسا کہ سر تھامس منرو نے مختصر اور مدلل انداز میں کہا ہے "ایک آزاد پریس اور اجنبی لوگوں کا اقتدار دو متضاد چیزیں ہیں اور یہ ایک ساتھ زندہ نہیں رہ سکتیں۔" اس ملک میں ہماری حکومت

صحیح معنوں میں ایک مقبول عام حکومت کبھی نہیں بن سکتی۔ اسے ایک ایسا جابرانہ طرز حکومت اختیار کرنا پڑے گا جس میں دانشمندانہ اور منصفانہ قوانین اور غیر جانبدار انتظامیہ کے ذریعہ لچک پیدا کی جائے۔"

لارڈ کیننگ نے دیسی اخبارات کی زباں بندی کا حکم جاری کرتے ہوئے آگے کہا:

"چنانچہ ایک جابرانہ طرز حکومت ہی اس ملک کے حالات کے تحت مناسب ہے اور ہمارے سامنے یہی ایک ممکن راستہ ہے۔ اگر پریس کی بے لگام آزادی، موجودہ طرز حکومت اور اس ملک میں ہمارے اقتدار کی برقراری سے موافقت نہیں رکھتی تو پھر پریس کی آزادی پر روک لگانی پڑے گی۔ بہت زیادہ پابندیوں کی ضرورت نہیں لیکن حکومت کو منظم طور پر رسوا کرنے، حقائق کو توڑنے مروڑنے اور آبادی کے مختلف طبقوں کے درمیان اور بالخصوص یوروپین افسروں اور دیسی سپاہیوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی تمام کوششوں کی روک تھام کرنی پڑے گی۔"(12)

اس ایکٹ کے تحت 1823 کے ایڈم ریگولیٹر کی دفعات کو معمولی ترمیم کے ساتھ سارے ہندوستان کے لیے ایک قانون کی شکل دے دی گئی۔ پریس کی آزادی پر یہ حملہ انگریز سامراج کی بوکھلاہٹ کو ظاہر کرتا ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انقلابیوں کی طرح اردو کے یہ اخبارات انگریز سامراج کے لیے ایک ایسا چیلنج بن کرابھرے تھے جس کا مقابلہ کرنے کی سکت ان میں نہیں تھی۔ اسی لیے ان اخبارات کی زباں بندی کی خاطر انھوں نے ایک ظالمانہ قانون کو نافذ کرنے کا سہارا لیا۔ اردو اخبارات نے 1857 کی جنگ آزادی کے دوران جو انقلابی کردار ادا کیا ہے اسے تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جانا چاہئے کیونکہ اردو صحافیوں نے قلم کی آزادی کی قیمت اپنے سروں کا نذرانہ پیش کرکے ادا کی۔ یہی اردو صحافت کا وہ سرفروشانہ کردار ہے جس پر ہم سب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

ہم آئندہ صفحات میں مذکورہ اخبارات کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں سے شائع ہونے والے ان اخبارات کے رول پر بھی روشنی ڈالیں گے جنہوں نے 1857 کی جنگ آزادی میں نمایاں طور حصہ لیا اور جس کی وجہ سے برطانوی سامراج کو اپنی بنیادیں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں لیکن اس سے قبل ایک سرسری نگاہ 1857 کی جنگ آزادی کے پس منظر پر ڈالتے ہیں تا کہ ہمیں اس موضوع کو صحیح تناظر میں سمجھنے میں مدد ملے۔

حوالے

1۔ 'صحافت': ایم چلا پتی راؤ، صفحہ: 84

2۔ 'اردو صحافت انیسویں صدی میں'، صفحہ: 353

3۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید: News Letters in Orient، اسلام آباد 1988، صفحہ: 86

4۔ ایم چلا پتی راؤ: 'صحافت'، صفحہ: 81

5۔ امداد صابری: 'اردو کے اخبار نویس'، صفحہ: 274

6۔ 'صحافت پاکستان و ہند میں'، صفحہ: 170

7۔ 'دہلی اردو اخبار': 21/جون 1857، نمبر: 24، جلد: 19

8۔ خواجہ حسن نظامی: مقدمہ بہادر شاہ ظفر، الفیصل لاہور، 1990، صفحہ: 68 تا 69

9۔ 'صادق الاخبار'، شمارہ 2/اپریل 1857

10۔ عتیق صدیقی: 'ہندوستانی اخبار نویسی'، صفحہ: 263

11۔ 'صحافت': ایم چلا پتی راؤ، صفحہ: 84

12۔ 'صحافت': ایم چلا پتی راؤ، صفحہ: 86

پس منظر

1600 عیسوی میں مغل فرماں روا نور الدین محمد جہانگیر کے دور حکومت میں برطانیہ کی ملکہ الزبتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک چارٹر کے ذریعہ ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت دی۔ 1608 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں اپنی تجارتی سرگرمیاں شروع کردیں لیکن اس کی بدنیتی کا اندازہ اس وقت ہوا جب کمپنی کے کارپردازوں نے تجارتی روابط قائم کرتے کرتے مقامی حکمرانوں کے معاملات میں مداخلت شروع کردی اور ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ملک کے بیشتر علاقوں پر ان کا تسلط ہوگیا۔ تجارت کی آڑ میں ہندوستان کو غلام بنا لیا گیا اور یہاں سامراجی نظام قائم کردیا گیا۔

ہندوستان کو سامراج کے آہنی پنجوں سے چھڑانے کے لئے اولین قربانی نواب سراج الدولہ نے پیش کی۔ دوسرا مجاہدانہ اقدام شیر ہندوستان ٹیپو سلطان نے کیا جنہیں انگریز اپنے عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے تھے۔ ٹیپو سلطان نے بہادری سے میدان جنگ میں انگریز سپاہ کا مقابلہ کیا اور جام شہادت نوش فرمایا۔ وہ دنیا کے ان معدودے چند بادشاہوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے میدان جنگ میں لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ہی انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے مکمل قبضہ کا اعلان کیا تھا۔

فرنگی استعمار سے ملک کو آزاد کرانے کی تیسری بڑی کوشش وہ تحریک تھی جسے تحریک

ولی اللّٰھی کے نام سے جانا جاتا ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان کی قیادت میں شروع کی گئی تھی۔ چوتھی بڑی کوشش 1857 کی جنگ آزادی ہے جسے انگریزوں نے 'غدر' جیسے مہمل نام سے موسوم کیا ہے۔ اس تحریک نے اچانک ہندوستان گیر شکل اختیار کر لی۔ آج 1857 کی تحریک کو ملک کی پہلی جنگ آزادی کا نام ضرور دیا جاتا ہے لیکن تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنے والے اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے اس سے قبل جو مجاہدانہ کوششیں کی گئیں وہ کسی بھی طرح نظر انداز یا فراموش کئے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ 1857 کی تحریک کو ملک گیر پیمانے پر منظم کرنے میں علماء نے اہم ترین رول ادا کیا۔ ان میں سب سے نمایاں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کا نام ہے۔ ان کے علاوہ ولی اللّٰھی تحریک کے بے شمار علماء ملک کے گوشے گوشے میں سرگرم رہے۔ 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے ہندستانیوں پر مظالم کے جو پہاڑ توڑے وہ ظلم و جبر کی ایک ہولناک تاریخ ہے۔ انگریزوں نے جذبہ آزادی کو کچلنے کے لئے 5 لاکھ سے زیادہ ہندوستانیوں کو تختہ دار پر چڑھا دیا۔(1)

بغاوت کی تیاری کے لئے ملک میں مسلسل کوششیں کی گئیں۔ اعلانات اور اشتہارات شائع کئے گئے۔ بعض مؤرخین نے ایک اشتہار کا ذکر کیا ہے جو کسی ایرانی شہزادے کے خیمے سے جنگ ایران کے زمانے میں برآمد ہوا۔ اس میں ایران اور افغانستان کے حالات بتاتے ہوئے انگریزوں کے خلاف جہاد کی دعوت دی گئی تھی۔ اسی زمانے میں جامع مسجد دہلی کے دروازے پر ایک اشتہار پایا گیا جس میں ڈھال اور تلوار کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ شاہ ایران عنقریب آنے والے ہیں اور مسلمانوں کو چاہئے کہ انگریزوں سے جہاد کے لئے تیار ہو جائیں۔ مٹکاف نے بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ اس پکار پر پانچ سو مسلمانوں نے جہاد پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بغاوت سے چند روز قبل بھی ایک اشتہار جامع مسجد میں چسپاں کیا گیا جس میں بغاوت کی جانب اشارہ تھا۔ دہلی میں دوسری جگہوں پر بھی اشتہارات

لگائے گئے ان اشتہارات کا ذکر اس دور کے اخبارات میں ملتا ہے۔جس پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

تحریک آزادی 1857 کے لئے پورے ملک کو تیار کرنے میں مولوی احمد اللہ شاہ کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ملک کے دور دراز علاقوں کے دورے کر کے عوام کو بغاوت کے لئے آمادہ کرر ہے تھے۔وی ڈی ساورکر نے میلسین کے حوالے سے لکھا ہے کہ

> ''بیشک اس تمام سازش کا اہتمام مولوی احمد اللہ شاہ کا تھا اور یہ سازش تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔یقینی طور پر آگرہ جہاں اس مولوی نے کچھ عرصے قیام کیا تھا اور دہلی میرٹھ، پٹنہ اور کلکتہ وغیرہ سازش کے مرکز تھے۔''(2)

چربی والے کارتوس

یوں تو 1857 کی بغاوت میں کئی عوامل کارفرما تھے لیکن بغاوت کی چنگاریاں جس وجہ سے شعلوں میں تبدیل ہوئیں وہ چربی آمیز کارتوس تھے جنہیں دیسی سپاہ کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا۔سپاہیوں کے درمیان جو رائفلیں تقسیم کی گئی تھیں ان کے کارتوس گائے اور سور کی چربی سے آلودہ تھے۔کارتوس کو استعمال کرنے سے پہلے انہیں دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا جس سے ہندو اور مسلمان دونوں سپاہ کے مذہبی جذبات کی توہین ہوتی تھی لہٰذا اس مکروہ سازش کے خلاف دیسی سپاہ میں اشتعال پھیلنا ایک فطری عمل تھا لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے اس چنگاری کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھلواڑ کرنے کی یہ کوشش فرنگیوں کو اتنی مہنگی پڑے گی اس کا انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا۔دراصل یہ کام کمال عیاری اور خفیہ طریقے سے انجام دیا گیا تھا جونہی اس کی خبر عام ہوئی تو انگریزوں کے خلاف نفرت کی دبی ہوئی ساری چنگاریاں شعلوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔اردو اخبارات نے اس موقعہ پر اپنی ذمہ داریوں کو بہت آگے بڑھ کر پورا کیا اور انہوں نے اس سازش کے خلاف عوامی بیداری

پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اردو زبان سے اٹوٹ محبت رکھنے والے کٹر عیسائی گارساں دتاسی نے لکھا ہے:

> ''ان منحوس کارتوسوں کی تقسیم کے موقعہ پر ہندوستانی اخبارات نے جو بد دلی پھیلانے والوں کے آلہ کار تھے، اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اہل ہند کو کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کرنے پر اکسایا اور یہ باور کرایا کہ اس حیلے سے انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے تھے۔ یہ حیلہ تھا یا واقعہ ہم سمجھ نہیں سکتے، بہر حال ان لوگوں کی بے احتیاطی ضرور قابل افسوس ہے۔''(3)

چربی والے ان کارتوسوں کو ہی دراصل 1857 کی جنگ آزادی کا نقطہ آغاز قرار دیا جاتا ہے اس لئے ہم ذرا تفصیل سے اس معاملہ پر روشنی ڈالیں گے۔

انگریزوں نے دیسی سپاہیوں کے مذہبی جذبات سے کھلواڑ کرنے کی کوششیں 1806 سے ہی شروع کر دی تھیں۔ اس سال مدراس پریزیڈنسی کے افسروں نے اپنے سپاہیوں کے بارعب دکھائی دینے کے لئے یہ حکم جاری کیا کہ ''وہ ایک خاص پیمائش کی داڑھی رکھیں اور پرانی طرز کی پگڑیوں کے بجائے چمڑے کا جھبہ لگی ٹوپیاں پہنیں اور پریڈ کے وقت ذات پات کو ظاہر کرنے والی کسی علامت کو استعمال نہ کریں''۔ اس زمانے میں ہندو سپاہیوں کا تلک لگانا اور مسلمان سپاہیوں کا داڑھی رکھنا ایک عام بات تھی۔ نئی پگڑی میں چمڑے کا جھبہ لگانے کا حکم انگریزوں کا سب سے بدبختانہ قدم تھا۔ سپاہیوں کو شک تھا کہ یہ جھبے سور یا گائے کی چربی سے بنے ہوئے ہیں جسے چھونا ہی انہیں ناپاک کرنے کے لئے کافی تھا۔ سپاہیوں کو محسوس ہوا کہ ان اقدامات سے انگریز انہیں عیسائی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ اس قسم کی چربی والے جھبے ویلور میں ہوئی بغاوت کی وجہ تھے جس طرح کہ چربی والے کارتوس پچاس سال بعد ہونے والی بغاوت کا سبب بنے۔(4)

خوف اور بے اطمینانی صرف فوج تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ عوام میں بھی پھیل گئی

کیونکہ انگریزوں کی بدنیتی اور ہندو مسلم عقائد پر پے در پے حملوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کا مقصد صرف ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کرنے اور یہاں کے مال و دولت کو لوٹنے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد پر بھی ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے چاروں طرف یہ خبر تھی کہ لوگوں کو عیسائی بنایا جائے گا۔ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں نے اس آگ میں گھی کا کام کیا۔ اسکول، اسپتال، جیل اور ہاٹ بازار ہر جگہ عیسائی مشنری موجود تھے۔ اعلیٰ حکام کے ایماء اور سرپرستی میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے والے یہ مشنری ہندو اور مسلم رسوم و رواج کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کے اس پروپیگنڈے نے کہ 'تمام غیر عیسائی جہنم کی آگ کا ایندھن بنیں گے' عوام کے دلوں میں غم و غصہ کے جذبات بھڑکا دیئے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی کہ اسکولوں میں بائبل کی تعلیم شروع کر دی گئی۔ اس دوران یہ افواہ بھی پھیلی کہ سرکار ذات پات کے نظام کو توڑنے اور ہندو دھرم کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔

1857 کے اواخر میں فوج کے لئے نئے کارتوس ایجاد ہوئے اور ان کے استعمال کی تربیت ڈم ڈم انبالہ اور سیالکوٹ وغیرہ کے فوجی مرکزوں میں دی گئی۔ 1857 کے ابتدائی ایام میں یہ کارتوس رائج ہو گئے اور ڈم ڈم میں ان کی تیاری کا کارخانہ بھی قائم ہو گیا۔

جنوری 1857 کے ایک روز چھوٹی ذات کے ایک سپاہی نے پانی پینے کے لئے ایک برہمن سپاہی سے اس کا لوٹا مانگا۔ برہمن نے اس کی ذات پوچھی اور یہ کہتے ہوئے کہ چھوٹی ذات کے سپاہی کے ہونٹ لوٹے کو ناپاک کر دیں گے، پانی دینے سے انکار کر دیا۔ سپاہی نے جواب دیا کہ ''ذات کیا پوچھتے ہو' کچھ دن بعد تمہاری ذات بھی نہ رہے گی کیونکہ اب نئے کارتوس کاٹنا پڑیں گے جن میں گائے اور سور کی چربی استعمال ہو رہی ہے۔'' یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور جنوری 1857 میں اس کے خلاف دیسی سپاہ کے جذبات بے قابو ہونے لگے۔

22 جنوری 1857 کو لیفٹیننٹ رائٹ نے اپنی رپورٹ میں ڈم ڈم کے

میجر بون ٹین کو لکھا تھا:

''میں نے کل دیسی سپاہ کی پریڈ کرائی...... دو تہائی آدمی آگے آئے جن میں دیسی سپاہ کے تمام کمیشن افسر بھی تھے، انہوں نے پورے احترام کے ساتھ کارتوسوں پر اعتراض کیا کہ ان میں جو مکسچر استعمال کیا جارہا ہے وہ ان کے مذہبی احساسات کو مجروح کرتا ہے۔ انہوں نے اس چربی کے بجائے ایک دوسرا متبادل طریقہ بتایا۔'' (5)

چربی والے کارتوسوں کی سازش بے نقاب ہونے کے بعد جب دیسی سپاہیوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑی تو فرنگیوں نے اس معاملے کو دبانے کی کوشش کی اور حکومت نے فوراً احکامات جاری کئے کہ آئندہ گائے اور سور کی چربی استعمال نہ کی جائے۔ انگریز مؤرخ جی ڈبلیو فارسٹ نے جو سرکاری دستاویزیں شائع کی ہیں، ان سے یہ ثابت ہے کہ دراصل ان کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی ملا کر استعمال کی جاتی تھی۔ لارڈ رابرٹس کہتا ہے:

''مسٹر فارسٹ کی حالیہ تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ کارتوس چکنانے کے لئے جو مکسچر استعمال کیا گیا وہ واقعی قابل اعتراض اشیاء یعنی گائے اور سور کی چربی سے بنایا گیا تھا اور اس سے سپاہ کے جذبات کی حیرت انگیز طور پر توہین ہوتی تھی۔'' (6)

دیسی سپاہیوں کے شبہات میں اضافہ ہوتا رہا۔ مزید یہ کہ اسی زمانے میں آٹے میں ہڈیوں کا سفوف ملانے کی افواہیں بھی پھیلنے لگیں۔ گورکھا رجمنٹ کو یہ کارتوس دیئے گئے اور انگریز افسروں نے دھمکیاں دیں کہ دیسی سپاہ کو زبردستی استعمال پر مجبور کیا جائے گا۔ بعض مقامات پر سپاہ کے انکار کرنے پر پوری رجمنٹ کو سخت سزا دی گئی۔

مرشد آباد کے قریب برہام پور میں رجمنٹ نمبر 19 کے سپاہیوں نے جب کارتوسوں پر شبہ ظاہر کیا تو انہیں سخت لب ولہجہ میں دھمکیاں ملیں لیکن جب ان دھمکیوں کا کوئی اثر نظر نہیں آیا تو انہیں سزا دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ 31 مارچ 1857 کو

بارک پور پہنچنے پر ان کے ہتھیار چھین لئے گئے اور برطرفی کا حکم صادر ہوا۔ سپاہ میں بغاوت کے لئے سازشیں برابر ہو رہی تھیں۔ چند روز قبل ہی دو سپاہیوں کو سازش کرنے پر 14 سال قید با مشقت کی سزا ہو چکی تھی۔ جمع دار سالگ رام کا اس جرم میں کورٹ مارشل ہو چکا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے نئے کارتوس کی حقیقت بیان کی تھی۔ 29 مارچ کے بعد دوپہر رجمنٹ نمبر 34 کے جنرل بف نے سنا کہ اس کے ایک سپاہی نے سارجنٹ میجر پر گولی چلائی ہے۔ وہ فوراً موقعہ پر پہنچا جہاں منگل پانڈے کی گولی سارجنٹ میجر کا خاتمہ کر چکی تھی اور منگل پانڈے اپنے دیگر ساتھیوں کو بغاوت کے لئے پکار رہا تھا۔ لیفٹیننٹ بف کے گھوڑے کو گولی لگی اور وہ مع گھوڑے کے گر پڑا۔ پانڈے اپنی بندوق بھر ہی رہا تھا کہ لیفٹیننٹ نے اٹھ کر پستول سے فائر کیا مگر نشانہ چوک گیا۔ آخر کار منگل پانڈے پر مقدمہ قائم ہوا اور اس پر زور ڈالا گیا کہ خفیہ انقلابی تنظیم کے راز اور سازش کرنے والوں کے نام بتا دے، مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ اسے پھانسی کا حکم ہوا اور 8 اپریل 1857 کو منگل پانڈے کو پھانسی دے دی گئی۔

انبالہ میں بھی نئے کارتوسوں کی ٹریننگ کا مرکز قائم کیا گیا تھا۔ یہاں دیسی سپاہ کے افسروں نے کارتوسوں پر بے چینی کا اظہار کیا اور کارتوس کاٹنے والوں کو عیسائی ہو جانے کے طعنے دیئے۔ مسٹر کے سی یادو نے اپنی تصنیف 'ہریانہ میں 1857 کی بغاوت' میں تفصیل کے ساتھ کارتوسوں کے واقعات سرکاری ریکارڈ کے حوالوں سے بیان کئے ہیں۔

یکم مئی 1857 کو لکھنؤ کی سپاہ نے بھی کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ انگریز افسران نہ صرف ان کی کوئی بات ہمدردی سے سننے کو تیار نہیں بلکہ انہیں اس کام کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے جو ان کے ضمیر کیخلاف ہے۔ اس اثناء میں ملک کے مختلف حصوں میں آگ لگنے کی وارداتیں ہونے لگیں۔ اپریل کے آخر تک دہلی، لکھنؤ، میرٹھ وغیرہ میں بھی آگ کی وارداتیں ہوئیں۔ لکھنؤ میں صبح آٹھ بجے سپاہ کو پریڈ پر بلا لیا گیا۔ چاروں طرف سے مسلح گورا افواج نے اسے گھیر لیا۔ سامنے توپ خانہ نصب

ہوا اور گولہ باری کے لئے مہتابیں روشن کی گئیں۔ حالات کو بھانپ کر زیادہ تر سپاہی جان بچانے کے لئے بھاگے تو ان کا پیچھا کیا گیا۔

سپاہیوں نے 3 مئی کو ہی کارتوس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لکھنؤ کے اخبار 'طلسم' نے یہ حالات مخصوص انداز میں بیان کئے ہیں۔ اس کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یکم مئی سے پہلی ہی بغاوت کے آثار تھے جو ایک ڈاکٹر کی شرارت کا نتیجہ تھے۔ یکم مئی کے اخبار 'طلسم' کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

> ''ظاہراً ڈاکٹر کی دوا نے یہ اثر دکھایا ہے۔ بنگلہ بھی اس کا جلا، کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ ہنگامہ مچایا ہے۔ ڈاکٹر نے عمداً ہندو، مسلمان کا ایمان بگاڑا تھا۔ دبے ہوئے فتنے کو ابھارا تھا۔''(7)

یہ ڈاکٹر ویلس کا واقعہ ہے جو ملٹری سرجن تھا اور ایک فوجی اسپتال میں دوا کی بوتل منہ سے لگالی تھی جس پر فوجیوں میں شدید ناراضگی پیدا ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر کا بنگلہ جلا دیا گیا، وہ بمشکل جان بچا پایا۔

بغاوت کی شروعات

23 اپریل 1857 کو میرٹھ میں کرنل اسمتھ نے حکم دیا کہ اگلی صبح 90 منتخب چھاپہ مار پریڈ کریں گے۔ وہ اپنے آدمیوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ایک طریقہ کار کے تحت کس طرح وہ کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹے بغیر اپنی بندوقوں میں بھر سکتے ہیں لیکن سپاہیوں کو ان کارتوسوں سے نفرت ہو چکی تھی اور انہوں نے انھیں ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ میرٹھ میں یورپین فوج کثیر تعداد میں موجود تھی۔ جس کی وجہ سے کرنل اسمتھ کا خیال تھا کہ وہ اپنے حکم کی تعمیل کروالیں گے۔ اس لئے وہ پریڈ کروانے کے اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ پریڈ میدان میں جمع ہوئے 90 سپاہیوں کو اسمتھ نے سمجھایا کہ نئے قواعد ان کے مذہبی جذبات کو ذہن میں رکھ کر وضع کئے گئے ہیں لیکن اسمتھ کے اصرار کا سپاہیوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ 90 میں سے 50 سپاہیوں نے کارتوس لینے سے

انکار کر دیا۔ پریڈ منتشر ہوگئی۔ نافرمان سپاہیوں کو گرفتار کر کے ان کا کورٹ مارشل کیا گیا اور جیل میں ڈال دیا گیا۔

میرٹھ میں 9 مئی کو صبح حکم کی تعمیل نہ کرنے والوں کو پوری بریگیڈ کی موجودگی میں سزا دی گئی۔ ان کی وردیاں اتروالی گئیں اور لوہاروں نے انہیں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دیں۔ لوہاروں نے اپنا کام بہت آہستہ آہستہ کیا۔ سپاہی اپنے ساتھیوں کو ایک گھنٹہ سے بھی زیادہ وقت تک بے عزت ہوتا ہوا دیکھتے رہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں اس سے زیادہ دلدوز منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

گرمی کا یہ لمبا دن امن وچین سے گزر گیا لیکن اگلے روز یعنی 10 مئی کی شام کو 5 بجے اچانک طوفان برپا ہوگیا۔ گرفتاری کی غرض سے برطانوی افواج کے آنے کی افواہ نے سپاہیوں کو ہتھیار اٹھا لینے پر مجبور کیا۔ تیسری رجمنٹ کے گھوڑ سوار پرانی جیل کی طرف آ گئے اور اپنے گرفتار شدہ ساتھیوں کو چھڑا لیا۔ شہر کے دکانداروں نے فوراً اپنی دکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیں۔ غنڈے بازار کی لوٹ پاٹ میں شامل ہو گئے اور آدھی رات تک نواحی گاؤں سے لاقانونیت پر یقین رکھنے والے گوجر شہر میں داخل ہو گئے۔ بغاوت شروع ہو چکی تھی اس کے بعد لوٹ مار اور قتل وغارتگری کا وحشیانہ دور شروع ہوا۔ قاتل ذات اور جنس کا امتیاز کئے بغیر اپنا کام کرتے رہے۔ غصے اور اشتعال سے بھرے گروہوں نے انگریزوں کے گھروں میں آگ لگاتے ہوئے اور یورپینوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے پورا شہر تہ وبالا کر ڈالا۔ خوف نے سپاہیوں کو جنونی بنا دیا تھا۔ لیکن انہوں نے خود گھناؤنے جرائم کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ ٹولی جیل سے بھاگے قیدیوں اور جھگی جھونپڑی میں رہنے والے لوگوں نے انسانیت سوز حرکتیں کیں۔ شہر میں پولیس نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ قانون شکن گوجروں نے اس موقع کا سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں کو بے رحمی سے لوٹ کر انہیں قتل کر دیا گیا۔ گوجروں کی وحشت کا ہندوستانی بھی ایسے ہی نشانہ بنے جیسا کہ یورپین لوگ۔

میرٹھ کے کمانڈنگ آفیسر جنرل ہیوٹ کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ کوئی فیصلہ نہیں

کر پائے اگر چہ ان کے پاس قابل افسروں کی کمی نہیں تھی۔ ایک برٹش فوجی افسر نے جو اس وقت وہاں موجود تھا کہا کہ ''دراصل ہمارے فوجی حکام کو لقوہ مار گیا تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے اور کچھ بھی نہیں کیا گیا۔'' اس سے پہلے انگریزوں نے کبھی اپنے آپ کو اتنا غیر محفوظ اور بے یارومددگار محسوس نہیں کیا تھا۔ سپاہی زیادہ دیر تک میرٹھ میں نہیں ٹھہرے۔ ان میں کچھ تو حفاظتی نقطۂ نگاہ سے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن ایک بڑی تعداد نے دلی کی طرف کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ (8)

بہادر شاہ ظفر

دہلی میں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا اقتدار لال قلعہ کی چہار دیواری تک محدود تھا۔ جہاں ان کی شاہی شان و شوکت برقرار تھی۔ ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ انگریزوں سے ملنے والی پنشن تھی جسے ان کے درباری انگریزوں کا نذرانہ تصور کرتے تھے۔ ہرچند کہ بہادر شاہ ظفر پوری طرح انگریزوں پر منحصر تھے لیکن عوام الناس کی نظر میں ان کی حیثیت اب بھی ہندوستان کے ایک بااختیار بادشاہ جیسی تھی۔ وہ 1837 میں تخت نشین ہوئے۔ ان میں اپنے اجداد یعنی ظہیر الدین محمد بابر اور جلال الدین محمد اکبر جیسی دلیری اور تیزی نہیں تھی۔ ہر مغل بادشاہ اپنے آباء جیسی عزت و توقیر حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن بہادر شاہ ایسے نہ تھے کہ وہ انگریزوں کے لئے پریشانیاں پیدا کریں۔ جب انہوں نے انگریزوں سے اپنی پنشن بڑھانے کا مطالبہ کیا تو کمپنی نے یہ شرط رکھی کی وہ اپنے خطاب اور قلعہ چھوڑ دیں۔ بہادر شاہ کی خواہش تھی کہ ان کے نابالغ بیٹے جواں بخت کو ان کا جانشین تسلیم کیا جائے۔ جواں بخت، زینت محل سے بڑھاپے میں پیدا ہوا لاڈلا بیٹا تھا۔ لیکن انگریز بادشاہت کے اس سلسلہ کو ہی ختم کرنے کے حق میں تھے، کیونکہ بادشاہ کی موجودگی میں برٹش سرکار کا درجہ ایک ریاست کا معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے بہادر شاہ ظفر کی خودمختاری کا اظہار کرنے والی رسوم کو یکے بعد دیگرے ختم کر دیا گیا۔ بہادر شاہ اس بے عزتی پر بہت رنجیدہ ہوئے لیکن وہ اپنے جذبات کو سرعام ظاہر کرنے کی پوزیشن میں

نہیں تھے۔ لارڈ ڈلہوزی شاہ کے خطاب کو ختم کرنا اور شاہی خاندان کو شہر سے باہر ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل کرنا چاہتا تھا لیکن کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ڈلہوزی کو بہادر شاہ کی موت تک انتظار کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ بوڑھے اور ناتواں بادشاہ کے تادیر زندہ رہنے کی امید نہیں تھی اور بہادر شاہ کی موت کے بعد ان کے نااہل وارثین کا ان کے آبائی محل سے نکالا جانا یقینی نظر آتا تھا۔ مرزا فخرو کو اس شرط پر انگریزوں نے ولی عہد تسلیم کیا تھا کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے انتقال کے بعد قطب صاحب (مہرولی) میں جا کر رہیں گے۔

ایک چشم دید مبصر ولیم رسل (نامہ نگار اخبار 'ٹائمز' لندن) کے لفظوں میں:

''بادشاہ کے لئے چند حقیر قسم کی مراعات باقی چھوڑ دی گئی تھیں جو اس سابقہ اقتدار کا ایک مذاق تھیں جس کی وہ نمائندگی کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بھی اس کے جانشینوں سے لے لی جائیں گی اور انہیں قلعے سے بھی نکال کر کہیں اور بسا دیا جائے گا۔ ہم نے اس کے خاندان کے لئے ملازمت کے دروازے بند کر دیئے۔ ہم نے انہیں قلعہ میں حقارت آمیز، پسماندہ اور مقروض زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔'' (9)

11 مئی 1857 کی صبح میرٹھ سے کوچ کرنے والے باغی سپاہیوں نے دلی پہنچنے کے لئے کشتیوں کے پل کے ذریعہ جمنا کو عبور کیا۔ شہر ابھی تک میرٹھ کے واقعات سے بے خبر تھا۔ اس لئے دلّی میں اس صبح تک سب کچھ پُر سکون تھا۔ اچانک یہ خبر پھیلی کہ میرٹھ کے گھوڑ سوار شہر کے دروازے پر آ گئے ہیں۔ انہوں نے جنگی افسر کو قتل کر کے اس کے دفتر کو نذر آتش کر دیا ہے۔ گرمیوں کی اس صبح نے خونریزی اور ہلاکتوں کا خوفناک نظارہ دیکھا۔ یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی کہ سپاہیوں نے میرٹھ میں فرنگیوں کو مار ڈالا ہے اور مذہب کے لئے لڑنے دہلی آ گئے ہیں۔ اس خبر کے ذریعہ بہت سے ایسے شہریوں نے جو انگریزوں کو دراندازاور بدمعاش سمجھتے تھے، اس لڑائی میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی اور جب گھوڑ سوار شہر کے اندر داخل ہوئے تو مقامی جنگجو بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

بہادر شاہ ظفر کے لئے یہ خبر حیرت انگیز اور غیر متوقع تھی۔ قلعے کی پشت پر جھروکہ کے

نیچے جمنا کی ریتی میں باغی فوجیں اکٹھا ہو گئیں۔ یہ شور و غوغا سن کر بادشاہ پریشان ہو گئے۔ ان کے کمزور دل میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ وہ اس ہجوم کا سامنا کر سکتے چنانچہ انہوں نے فوراً انگریز قلعہ دار کپتان ڈگلس کو بلا بھیجا۔ اس اثناء میں حکیم احسن اللہ خاں نے تسبیح خانے میں آکر باغی سواروں سے پوچھ گچھ کی جس کا حال ظہیر دہلوی☆ نے بیان کیا ہے:

> حکیم احسن اللہ خاں نے بہ موجب حکم تسبیح خانے میں آکر باغی سواروں سے استفسار کرنا شروع کیا۔ چند افسران گھوڑوں سے اتر کر پٹری پر آکر کھڑے ہو گئے اور زیر جھروکہ ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔
>
> ''حضور بادشاہ سلامت! آپ دین دنیا کے بادشاہ ہیں۔ آپ کو حق تعالیٰ نے بائیس صوبوں کا مالک کیا ہے۔ تمام ہندوستان آپ کا محکوم اور فرمانبردار ہے۔ ہندوستان کی رعیت آپ کی رعیت میں شمار ہوتی ہے۔ آج تک ہندوستان میں منادی پھرتی ہے تو یہی بیان کیا جاتا ہے ''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی کا۔'' انگریز لوگ آپ کی طرف سے مالک و مختار ہیں، لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں، امیدوار انصاف ہیں، ہم ملازم انگریزی ہیں۔ سرکار کی نیت میں فتور ہوا اور ہمارے دین و مذہب کے درپے تخریب ہوئے اور چاہا کہ تمام ہندوستان کو عیسائی کر لیں۔ ہم لوگوں کو خیال دین و آئین دامن گیر ہوا، نزاع بڑھ گئی، مقدمہ طول کھینچ گیا۔(10)

باغی سپاہ کی یہ تقریر بادشاہ کے لئے ناقابل یقین تھی۔ انہیں اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کا بخوبی علم تھا۔ وہ انگریزوں کے خلاف ایسا قدم خواب و خیال میں بھی نہیں اٹھا سکتے تھے، اس لئے اس صورتحال سے انہوں نے فوری طور پر جو نتیجہ اخذ کیا، وہ یہ تھا

☆ ظہیر دہلوی ایک نامور شاعر تھے جو بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ تھے۔ چند سال گزرنے کے بعد انہوں نے اپنی آپ بیتی 'داستان غدر' لکھی جس میں دہلی کے واقعات، اپنے مصائب اور ان لوگوں کے آلام قلم بند کئے جن پر باغیوں کے ساتھی اور ہمدرد ہونے کا شک تھا۔

کہ فوج نے جو کچھ کیا ہے محض نادانی کی بنا پر کیا ہے، چنانچہ انہوں نے فوج کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''سنو بھائی، مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو برسوں پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جد و آبا کے نوکر چاکر اپنے خداوند نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے۔ میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا، قوت لا یموت کو محتاج ہو گئے۔ میں تو ایک گوشہ نشیں آدمی ہوں، مجھے ستانے کیوں آئے ہو، میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تمہیں تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کرکے تمہیں نوکر رکھوں گا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں، مجھ سے کسی طرح توقع استطاعت کی نہ رکھو۔(11)

انگریز مؤرخین نے باغی سپاہ اور بہادر شاہ ظفر کے درمیان ایک منصوبہ بند سازش کا الزام عائد کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ 11 مئی 1857 تک بہادر شاہ ظفر کو اس انقلاب کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ انہیں اس شورش کی اطلاع 11 مئی کی صبح کو آٹھ بجے ملی تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ اس حادثہ کی تفصیل بہادر شاہ ظفر کے دربار سے شائع ہونے والے فارسی اخبار 'سراج الاخبار' کی جلد سیزدہم کے شمارہ نمبر 1 سے ملتی ہے۔

''صبح آٹھ بجے بادشاہ کو بتایا گیا کہ انگریزی فوج کے سوار اور پیدل ملازموں نے ضلع میرٹھ کے حکام کی حکم عدولی کی۔ افسروں کو قتل کر دیا اور دہلی پہنچ کر لال قلعہ کے پاس جوق در جوق زیر جھروکہ جمع ہو گئے۔ بادشاہ نے فوراً سیف الدولہ کو حکم دیا کہ قلعہ دار کپتان ڈگلس کو مطلع کرو۔ قلعہ دار وہاں آیا اور اس نے زیر جھروکہ ہجوم کو مخاطب کرکے کہا

کہ بادشاہ کو تکلیف مت دو، یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ۔ باغی سپاہی راج گھاٹ کی طرف چلے گئے۔ قلعہ دار زیرِ جھروکہ جانا چاہتا تھا مگر بادشاہ نے منع کر دیا اور اس کی حفاظت کے لئے احکام صادر کیے۔ تھوڑی دیر میں خبر آئی کی قلعہ دار اور دوسرے تمام مرد و عورتوں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے مکانات لوٹ لئے گئے اور پھر پورے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ جہاں کہیں بھی انگریز نظر آتا ہے، اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کو بھی لوٹا جا رہا ہے۔ دوپہر تک لوگوں کے گروہ کے گروہ فریاد کرتے ہوئے آئے کہ بادشاہ اپنے فرزندوں کو شہر کے انتظام پر مقرر کریں۔ بادشاہ نے مرزا ظہیر الدین بخت بہادر عرف مرزا مغل اور مرزا عبداللہ کو تعینات کیا کہ فوج لے کر شہر جائیں اور امن و امان قائم کریں۔"

'سراج الاخبار' کی اس رپورٹنگ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر اس انقلاب سے قطعی بے خبر تھے اور ان کے پاس اچانک برپا ہونے والی اس ہنگامہ آرائی سے نپٹنے کے وسائل موجود نہیں تھے۔

اسی اثناء میں باغی محل کی طرف دوڑ پڑے۔ قلعہ کے پہریدار، ان کا مقابلہ کرنے کے بجائے ان سے شیر و شکر ہو گئے۔ فریزر، ڈگلس اور ہچنسن قلعہ کے اندر ہی قتل کر دئے گئے۔ چپلین جیننگز، ان کی بیٹی اور اس کی دوست ولفرڈ کا بھی یہی حشر ہوا۔ باغیوں نے تب بادشاہ سے قیادت سنبھالنے کا اصرار کیا۔ بوڑھے بادشاہ نے غریبی اور ناتوانی کا عذر پیش کیا لیکن باغی اسے ماننے کو تیار نہ ہوئے۔ وہ اپنے بادشاہ کا تعاون حاصل کرنے اور انگریزوں سے لڑنے آئے تھے۔ بادشاہ آنا کانی کرتے رہے کیونکہ میرٹھ سے یورپین فوج کسی بھی وقت آسکتی تھی۔ وقت گزرتا رہا لیکن ادھر سے کوئی فوج نہیں آئی۔ جیسے جیسے دن بیت رہا تھا، ویسے ویسے حالات مایوس کن ہوتے جا رہے تھے، لیکن بادشاہ اب بھی باغیوں کی قیادت کرنے کو تیار نہ تھے۔ رات گہری ہو جانے پر ہی وہ باغیوں کا ساتھ

دینے کا فیصلہ کر سکے۔ آدھی رات کو 21 توپیں داغ کر بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ تسلیم کرتے ہوئے مغل سلطنت کے احیاء کا اعلان کر دیا گیا۔

میرٹھ کی طرح دلی میں یورپین فوج نہیں تھی۔ چھاؤنی ایک نواحی گاؤں راج پور میں واقع تھی۔ دلی کے کچھ سپاہی اب بھی پس و پیش میں تھے۔ 54ویں پیدل رجمنٹ تو کرنل ریلے کے ساتھ کشمیری گیٹ تک گئی لیکن اس کے کمانڈر کا سر قلم کر دیئے جانے اور افسروں کو گولی مار دیئے جانے کے باوجود خود اس نے گولی نہیں چلائی۔ باقی سپاہی میرٹھ کے باغیوں کے ساتھ مل گئے جس نے دلی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اس دوران شہر کی تقریباً پوری عیسائی آبادی کا (جس میں ہندوستانی بھی شامل تھے) صفایا کر دیا گیا۔ زیادہ تر لوگ تلوار سے ہلاک کئے گئے۔ بھگوڑوں نے بڑی تعداد میں فلیگ اسٹاف ٹاور میں پناہ لی، لیکن مدد کے کوئی آثار نہ دکھائی دینے پر وہ رات کی تاریکی میں مختلف سمتوں میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

پورا شہر ویران تھا۔ چھاؤنی خالی تھی لیکن میگزین (بارود خانہ) نے آسانی سے خود سپردگی نہیں کی۔ اس کا نگراں لیفٹیننٹ ولوبی آٹھ انگریز سپاہیوں کی مدد سے بدحواس عوام کے خلاف گھنٹوں مورچہ پر ڈٹا رہا۔ آخر کار ان سے بادشاہ کے نام پر خود سپردگی کرنے کو کہا گیا مگر زیادہ دیر تک لڑنے کا امکان نظر نہ آنے پر لیفٹیننٹ ولوبی نے بارود خانہ کو اڑا دیا۔ ایک بڑے دھماکے نے سینکڑوں باغیوں کی جان لے لی۔ انگریزوں میں سے تین اپنی چوکی پر ہی مارے گئے۔ لیفٹنٹ ولوبی اور پانچ دوسرے انگریز اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بھاگے ضرور لیکن کچھ دیر بعد ہی ولوبی کو میرٹھ کے راستے میں ایک مشتعل ہجوم نے مار ڈالا۔

مرزا مغل اس اثناء میں تمام افواج کے کمانڈر انچیف مقرر ہو چکے تھے۔ دوسرے شہزادوں کو بھی بڑے بڑے عہدے دیئے جا چکے تھے۔ شہری اور فوجی بدامنی کو روکنے کے لئے ایک کورٹ بنائی گئی جس کے دس ممبر تھے۔ کورٹ کی تشکیل کے بعد بہادر شاہ ظفر انگریزوں کی حمایت کا خیال چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور پھر پوری طرح انقلابیوں کے

ساتھ ہو گئے۔ انقلابی پہلے ہی انہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اور خبر 'سراج الاخبار' میں ملتی ہے لیکن یہ خبر 15 یا 16 مئی کے آس پاس ہی کسی دن سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں ان ترک سواروں کی آمد کا ذکر ہے جس کی افسری 16 مئی کو بادشاہ کے دربار میں مرزا کوچک سلطان بہادر اور مرزا ابوبکر بہادر کو سونپی جا چکی تھی۔ خبر اس طرح ہے:

> ''جس دن ترک سواران اور مردم پلاٹن جنگی، خدمت میں حاضر ہوئے تھے، تو بادشاہ نے کہا تھا کہ ہمارے پاس مال وخزانہ نہیں ہے جس سے تمہاری مدد کریں۔ ایک جان ہے اس سے دریغ نہیں۔ ترک سوار وغیرہ اس پر راضی ہو گئے۔ انہوں نے عرض کیا، ہم آپ کی فرماں برداری کے لئے حاضر ہیں۔ ارشاد ہوا میگزین اور خزانے کا بندوبست کرنا چاہئے تاکہ ہمارے کام آسکے۔'' (12)

12 مئی کو بادشاہ نے دربار عام منعقد کیا تھا جس میں انہوں نے شہر کے کچھ سرکردہ مسلمانوں کو بھی مدعو کیا اور ان سے ایک مجلس عاملہ بنانے کے لئے کہا۔ پوری دلی میں نراج کی سی کیفیت تھی۔ یوروپینوں اور عیسائیوں کی تلاشی لینے کے بہانے سماج دشمن عناصر شہر کے امیروں اور بڑے لوگوں کو لوٹ رہے تھے۔ دکانیں بند تھیں اور کاروبار ٹھپ تھا۔ فوج اور امن وقانون برقرار رکھنے کے لئے روپے کی ضرورت تھی جبکہ خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ بادشاہ کی اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا۔

شہر میں امن وامان برقرار رکھنے کی غرض سے ضعیف العمر بادشاہ خود ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کے معائنے کے لئے نکلے۔ بادشاہ نے دکانداروں کو تسلی دے کر ان کی دکانیں کھلوائیں اور لوگوں کو سمجھایا اور بعض کے گھروں پر جا کر انہیں صبر کی تلقین کی۔

مرزا مغل کو کمانڈر انچیف اور دوسرے شہزادوں کو اعلیٰ فوجی خطابات ضرور عطا ہوئے تھے لیکن ڈسپلن شکنی کرنے والے سپاہیوں کو قابو میں رکھنا شہزادوں کے بس کا روگ نہیں تھا۔ شہری اور فوجی علاقوں میں نظم ونسق کی بحالی کے لئے شہری اور فوجی انتظامیہ کمیٹی

بنائی گئی جو کہ کمانڈر انچیف کے ماتحت تھی۔ اگر چہ بادشاہ کا فیصلہ ہی حتمی تھا۔ کمیٹی انگریزوں کے دوبارہ اقتدار میں آنے تک برقرار رہی لیکن اگر حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ کمیٹی کچھ بھی حاصل نہ کر سکی کیونکہ نہ تو وہ فوج پر قابو پا سکی اور نہ ہی افسروں پر۔

مئی کا مہینہ ختم ہوتے ہوتے بادشاہ کو کئی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ سب سے بڑا مسئلہ مالی بحران کا تھا جس کی وجہ سے نظم ونسق متاثر ہو رہا تھا۔ اس لئے بینک مالکوں کو قلعہ میں طلب کر کے سرکاری خزانے میں روپیہ دینے کو کہا گیا۔ بادشاہ کے دباؤ میں افسروں اور بینکوں نے فوجیوں کو ادا کرنے کے لئے ایک لاکھ روپیہ اکٹھا کئے لیکن یہ رقم ناکافی تھی۔

دلی پر باغیوں کا قبضہ ہونے کے اگلے روز یعنی 12 مئی سے لے کر 8 جون تک باغیوں کے لیڈروں کے پاس امکانی حملوں سے نپٹنے کی تیاری کے لئے کافی وقت تھا لیکن انہوں نے اس موقع کو گنوا دیا۔ جون میں سپاہیوں نے اپنے ہی خلاف آپس میں چھوٹے موٹے گروہ بنا لئے۔ تجارتی طبقہ نے فوج کی مدد نہیں کی اور بادشاہ شہزادوں اور سپاہیوں کی زیادتیوں سے رعایا کو بچانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔

انگریز سپاہ کے کمانڈر انچیف جنرل اینسن شملہ میں تعینات تھے، انہیں وہیں دلی کے ہاتھ سے نکل جانے کی اطلاع ملی۔ پنجاب کے کمشنر جان لارنس نے اینسن کو جلد از جلد دلی پر فیصلہ کن حملہ کا مشورہ دیا تاکہ دلی کو باغیوں سے آزاد کرایا جا سکے۔ لیکن اس کے لئے تیاری ضروری تھی۔ جنرل یہ سوچتے ہوئے انبالہ سے کرنال آیا کہ وہاں سے وہ دہلی جائے گا لیکن راجدھانی پہنچنا اس کے مقدر میں نہیں تھا۔ انگریز سپاہیوں کو جون کے مہینے کی لو اور تپش میں مارچ کرنے کی مشق نہیں تھی۔ بہت سے سپاہی ہیضے اور لو لگنے سے موت کے آغوش میں چلے گئے اور 27 جون کو خود کمانڈر انچیف اینسن بھی ہیضہ کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلا گیا۔

اینسن کے نوآموز جانشین سر ہنری برنارڈ نے بہت سوچ سمجھ کر ایک منصوبہ ترتیب دیا جس کے تحت بریگیڈیئر ولسن کی قیادت میں میرٹھ کی ٹکڑی باغپت میں برنارڈ سے

آملی۔ دریائے جمنا عبور کرنے سے پہلے انہوں نے غازی الدین نگر (غازی آباد) میں ہنڈن ندی کے پاس باغیوں کو شکست دی۔

8 جون کو دلی سے پانچ میل دور مغرب میں واقع بادلی کی سرائے میں ان کا مقابلہ باغیوں سے ہوا۔ اس لڑائی میں باغیوں کی ہار ہوئی۔ فاتح فوج اسی روز آگے بڑھی اور اس نے دلی کی بیرونی پہاڑیوں پر قبصہ کر لیا۔ 8 جون کو انگریزوں نے خود کو اپنی پرانی چھاؤنی میں موجود پایا۔

انگریزوں نے پہاڑی پر قبضہ کیا تو باغیوں کی فوج بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی نہ رہی۔ 10 جون کو سپاہیوں نے اپنے دشمنوں کے عقبی حصے کو دھمکایا، لیکن انگریزوں نے مٹکاف ہاؤس پر قبضہ کر کے وہاں فوجی دستہ تعینات کر دیا۔ اس کے بعد تقریباً ہر روز ہی لڑائی ہوتی رہی جس میں باغیوں نے اپنے جوہر دکھائے اور بہترین نشانہ بازی کا مظاہرہ کیا۔

اس دوران پنجاب سے انگریزی فوج برابر آ رہی تھی اور انگریز سپاہیوں کی تعداد تقریباً 7 ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ ادھر دلی میں باغی فوج کو بھی کمک مل گئی تھی۔ بریلی کی فوجیں 2 جولائی کو کمانڈر بخت خاں کی سربراہی میں دلی پہنچیں۔ بخت خاں نے اسی دن بادشاہ سے ملاقات کی اور بادشاہ نے مرزا مغل کی جگہ بخت خاں کو باغی افواج کا کمانڈر انچیف بنا دیا۔

برٹش سپاہیوں کا حوصلہ بلند تھا لیکن بھاری بندوقوں اور گولہ بارود کی سپلائی خاطر خواہ نہ تھی۔ اس کے علاوہ سپاہیوں کی طرف سے حکم عدولی اور اعتماد شکنی کے واقعات بھی ہوئے۔ تین غداروں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ 14 جولائی کو شہر کی دیواروں پر توپوں کی گولہ باری کے سائے میں باغیوں نے ہندوراؤ کے مکان اور سبزی منڈی پر حملہ کر دیا۔ دو دن بعد دل برداشتہ جنرل ریڈ نے اپنی جگہ ولسن کے لئے خالی کر دی مگر انگریز سپاہ کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ انہیں اپنے جاسوسوں سے یہ خبریں مل رہی تھیں کہ دیسی سپاہی تنخواہ کے لئے ہنگامہ آرائی کر رہے ہیں اور بھاگ رہے ہیں۔ پریشان بینک کار اور شہری انگریزوں کی اقتدار میں واپسی کے منتظر تھے۔ ادھر بقر عید کے موقعہ پر ہندوؤں اور

مسلمانوں کے درمیان فساد ہونے کی افواہیں بھی گرم تھیں۔ بقرعید آنے پر بادشاہ نے فوج کو حکم دیا کہ عید کے دوران شہر میں ایک بھی گائے ذبح نہ کی جائے اور اگر کسی مسلمان نے ایسا کیا تو اسے توپ سے اڑا دیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں بادشاہ نے ایک شقہ کوتوال شہر مبارک خاں کے نام سے فارسی میں جاری کیا اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

''حضور والا کا خاص شقہ حضور معلآ شجاعت نشان کے دستخطوں کے ساتھ: مبارک شاہ خاں کوتوال شہر کو معلوم ہو کہ کل تمام شہر میں شقہ خاص کے مطابق یہ منادی کرادی جائے کہ گائے کا ذبیحہ یا قربانی قطعی ممنوع قرار دے دی گئی۔ شہر کے تمام دروازوں پر یہ بندوبست کر دیا جائے کہ کسی بھی جانب سے گائے یا بھینس فروخت کرنے والے آج سے لے کر عید کے تین روز بعد تک گائے یا بھینس شہر میں نہ لائیں۔ جن مسلمانوں نے گائے پال رکھی ہیں، وہ اپنی گائے کوتوالی میں بندھوا دیں۔ اگر کوئی شخص خفیہ طور پر یا اعلانیہ گائے کی قربانی کرے گا، تو اسے موت کی سزا دی جائے گی'' (13)

اس موقع پر بادشاہ نے خود عید گاہ پر بھیڑ ذبح کر کے سنت ابراہیمی کو ادا کیا۔ اس لئے عید الاضحیٰ (یکم اگست 1857) کو کوئی فساد برپا نہیں ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اسی روز مل کر انگریزی دستہ پر حملہ کیا۔ یہ لڑائی دوپہر سے رات تک اور رات سے اگلے روز دوپہر تک جاری رہی۔ سپاہی کئی بار برطانوی صفوں تک پہنچے مگر گولہ بارود کی وجہ سے انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر وہ حملہ کرنے کے لئے واپس آتے رہے۔ دوسرے مقامات سے باغی ٹکڑیوں کے دلی پہنچنے پر انہوں نے اپنے عزم اور طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے پہاڑی پر حملہ کیا۔ دو مہینوں تک وہ مسلسل اپنے مخالفین سے برسرِ پیکار رہے لیکن ان کے پاس نہ تو کوئی جنگی منصوبہ بندی تھی اور نہ ہی ان میں کوئی جنگی حکمت عملی کا ماہر موجود تھا۔ بار بار کی ناکامی سے ان کا حوصلہ پست ہو گیا اور انہوں نے شکست کے لئے افسروں کی غداری کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ 7 اگست کو ایک میگزین میں دھماکہ

ہونے پر باغیوں کو حکیم احسن اللہ پر شک ہوا۔ ان کا گھر لوٹ کر نذر آتش کر دیا گیا۔ حکیم احسن اللہ کی گرفتاری عمل میں آئی مگر بادشاہ کی ان پر نظر کرم تھی لہٰذا انہوں نے بادشاہ کے دامن میں پناہ لے کر جان بچائی۔

بار بار کی شکستوں اور اعلیٰ افسروں کی غداری سے سپاہیوں کے اندر خود اعتمادی کا فقدان ہوگیا۔ اس کے برعکس پہاڑی پر تعینات انگریزی فوج کے حوصلے بلند تھے۔

11 ستمبر سے انگریزی توپ خانوں نے فصیلوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ 13 ستمبر کو کشمیری گیٹ کی فصیل شق ہوگئی۔ رات کے اندھیرے میں ان شگافوں کا معائنہ کیا گیا اور انہیں کارآمد پایا گیا۔ اسی روز ولسن اور اسمتھ نے آخری حملے کی منصوبہ بندی کی۔ حملہ آور فوجوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلی ٹکڑی کو ولسن کی قیادت میں کشمیری گیٹ کے پاس فصیل میں پیدا شدہ شگاف پر حملہ کرنا تھا۔ دوسری ٹکڑی کو جونس کی رہنمائی میں شگاف کو پرانے کسٹم ہاؤس تک بڑھانا تھا۔ تیسری ٹکڑی کو کیمپ بیل کی قیادت میں کشمیری گیٹ کو اڑا کر شہر میں داخل ہونا تھا۔ چوتھی ٹکڑی کو میجر ریڈ کی کمانڈ میں پہاڑ پور کے علاقے صاف کرتے ہوئے لاہوری گیٹ سے شہر میں داخل ہونا تھا۔ ان تمام کاروائیوں کی کمان نکلس کو سونپی گئی اور 14 ستمبر کی صبح شہر پر چوطرفہ حملہ آور ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔

دلی کے لئے جدوجہد

ریڈ کی ٹکڑی اپنے مقصد میں ناکام ہوئی اور اسے بے نیل مرام لوٹنا پڑا۔ حملہ کرتے ہی ریڈ زخمی ہوگیا اور اسے اٹھا کر پیچھے لے جایا گیا۔ ریڈ کی ٹکڑی کو پیچھے سبزی منڈی تک ڈھکیل دیا گیا۔ انگریز سپاہ کے لئے یہ تباہ کن پسپائی تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر سپاہیوں نے برٹش کیمپ پر پیچھے سے حملہ کیا ہوتا تو نہ صرف شہر بچ جاتا بلکہ انگریزی دستے دوطرفہ گولہ باری میں پھنس جاتے۔ لیکن کب اور کہاں حملہ کرنا چاہئے یہ بتانے والا کوئی سپہ سالار دلی کی فوج میں موجود نہیں تھا۔

نکلسن والی پہلی ٹکڑی نے موری گیٹ پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں آگے بڑھ کر کابلی گیٹ کو بھی قبضہ میں لے لیا۔ کابلی گیٹ کے بعد انہوں نے برن کی جانب پیش قدمی کی لیکن اس سے آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ یہاں سپاہیوں نے بہادری سے مقابلہ کیا اور حملہ آور دستوں کو گولہ باری سے خاصا نقصان پہنچایا۔ انگریز سپاہی بار بار آگے بڑھنے کی کوشش کرتے لیکن دفاعی ٹکڑیوں کی گولہ باری انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتی۔ اس معرکہ آرائی میں نکلسن اپنے آدمیوں کو لے کر آگے بڑھا لیکن گولی کا نشانہ بن کر ڈھیر ہو گیا۔ اس میں اتنی زیادہ ہلاکتیں ہوئیں کہ انگریز کابلی گیٹ تک واپس جانے پر مجبور ہو گئے۔

تیسری ٹکڑی نے اپنا کام بڑی ہمت کے ساتھ پورا کیا۔ وہ کشمیری گیٹ میں داخل ہو گئے۔ ہر چند کہ چاروں طرف موت کا رقص جاری تھا، انگریزی سپاہ کشمیری گیٹ کو اڑانے کے بعد شہر میں داخل ہوئی۔ مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی لیکن وہ اس کی پرواہ کئے بغیر پیش قدمی کرتے ہوئے جامع مسجد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں باغیوں نے مورچہ سنبھال رکھا تھا۔ جامع مسجد سے ہو رہی گولی باری نے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ غروب آفتاب تک شہر کا ایک حصہ دوبارہ انگریزوں کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا لیکن انہیں اس کامیابی کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اس معرکہ میں 1104 سپاہی اور 66 افسر مارے گئے۔

کمانڈر انچیف ولسن خاصے مایوس تھے کیونکہ سلیم گڑھ کا قلعہ، قلعہ بند محل اور اسلحہ خانہ ابھی تک باغیوں کے قبضہ میں تھا۔ ولسن اتنے افسردہ تھے کہ وہ فوج کو واپس بلانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ تاہم انگریزوں کی خوش بختی دیکھئے کہ انہوں نے 16 ستمبر کو اسلحہ خانہ پر قبضہ حاصل کر لیا۔ 17 سے 19 ستمبر تک سلیم گڑھ پر گولہ باری کی گئی اور اسی کے ساتھ انگریزوں کی حالت میں بہتری آنے لگی۔ بعد ازاں 20 ستمبر کو لال قلعہ اور نواحی سلیم گڑھ قلعہ میں فوجیں داخل ہو گئیں۔ لال قلعہ میں کوئی بھی زندہ نہیں بچا اور اسی رات جنرل ولسن نے اپنا ہیڈ کوارٹر محل میں منتقل کر دیا۔

اس طرح بھاری جانی نقصان اٹھا کر انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا۔ صرف انگریزوں کی طرف سے ہی 3837 سپاہی، افسران اور عام لوگ مارے گئے۔ دلی کے اس معرکے میں ہلاک ہونے والے سپاہیوں کی صحیح تعداد کا کسی کو علم نہیں۔ ولسن کے اندازے کے مطابق حملے سے قبل لڑنے والے باغیوں کی تعداد چالیس ہزار تھی۔

بہادر شاہ ظفر اور مغل شہزادے ابھی تک آزاد تھے اور ان کی گرفتاری کے بغیر انگریزوں کی کامیابی نامکمل تھی۔ بادشاہ پہلے مہرولی چلے گئے لیکن ایک غدار مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کو ہمایوں کے مقبرے میں منتقل ہو جانے پر رضا مند کر لیا۔ برطانوی جاسوس مولوی رجب علی نے مفرور لوگوں کے بارے میں گھوڑسواروں کے کمانڈر ہڈسن کو اطلاع دے دی۔ 21 ستمبر کو میجر ہڈسن نے ہمایوں کے مقبرے پہنچ کر بہادر شاہ ظفر کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر وہ خود سپردگی کر دیں گے تو ان کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔ لہٰذا اگلے روز ہڈسن گھوڑے پر سوار ہو کر ہمایوں کے مقبرے آیا اور مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابو بکر کو قید کر لیا اور بیل گاڑی میں بٹھا کر انہیں شہر کی جانب چل دیا۔

ہڈسن کا بیان ہے کہ ایک مسلح گروہ نے انہیں گھیر لیا تھا۔ ہڈسن جب شہزادوں کو گرفتار کر کے دہلی کی طرف بڑھا تو یہ ہجوم بھی اس کا تعاقب کرنے لگا۔ جب یہ لوگ دلی گیٹ کے نزدیک پہنچے تو ہڈسن نے شہزادوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے کپڑے اتار لیں۔ اس کے بعد ہڈسن نے خود اپنے ہاتھوں سے ان تینوں کو گولی مار دی۔ کچھ دیر کے وقفے کے بعد شاہی خاندان کے 21 شہزادوں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ مولوی ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق 'جب شہزادے مر گئے تو ہڈسن ان کی لاشوں کو لے کر کوتوالی پر آیا اور ایک رات ایک دن سر بازار لٹکائے رکھا۔(14)

بہادر شاہ ظفر کے آخری ایام

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ نہایت تکلیف دہ تھا۔ انہیں جیل میں مجرموں کی طرح رکھا گیا۔ ان کے رہنے سہنے کا انتظام

بھی بہت ناقص تھا۔ دلی سے گزرنے والا ہر انگریز، بہادر شاہ ظفر کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مسز کوپ لینڈ جن کے شوہر گوالیار میں مارے گئے تھے، مظلوم قیدیوں کو دیکھنے آئیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ: ''پردے کو ہٹا کر ہم ایک چھوٹے اور گندے کمرے میں داخل ہوئے، وہاں سفید سوتی کپڑوں میں ملبوس ایک چھوٹا، نحیف بوڑھا شخص چارپائی میں دھنسا ہوا تھا۔ سردی کے موسم میں وہ ایک معمولی اور ناقص رضائی میں لپٹا ہوا تھا۔ کمرے میں ہمارے داخل ہونے کے بعد اس نے حقہ ایک طرف سرکا دیا۔ جو شخص اپنے روبرو کسی کے بیٹھنے کو اپنی بے عزتی تصور کر رہا تھا، اسی نے ہمیں یہ کہتے ہوئے سلام کیا کہ ہمیں دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی ہے۔''

وقت گزاری کے لئے بہادر شاہ اپنے محبوب مشغلہ شعر و شاعری میں مصروف رہتے تھے۔ کاغذ اور قلم میسر نہیں تھا، اس لئے وہ جلی ہوئی ڈنڈیوں سے دیواروں پر اشعار لکھتے تھے۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بے بس و لاچار تھے اور حالات کو بدلنے کی سکت ان میں نہیں تھی۔ اس دوران انہیں انڈمان بھیجنے کی تجویز زیرِ غور آئی دراصل انگریز، بوڑھے نحیف اور بے بس لاچار بادشاہ سے اب بھی خوفزدہ تھے، اس لئے انہیں جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔

بہادر شاہ ظفر نومبر 1858 میں دہلی سے روانہ ہوئے اور ماہ دسمبر کی آخری تاریخوں میں رنگون پہنچے۔ ایک سے زیادہ مرتبہ ان کی وفات کی خبر مشہور ہوئی۔ بالآخر 7 نومبر 1862 کو وہ خوفناک آلام و مصائب کے زخموں سے نڈھال ہو کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

'کشف الاخبار' نے 8 جنوری 1863 کی اشاعت میں جلوۂ طور (مورخہ 25 دسمبر 1862) کے حوالے سے شائع کیا کہ بادشاہ نے آخری وقت میں دو وصیتیں کی تھیں۔ اول یہ کہ جنازہ ان کا سپردِ زمین ہو کر دہلی میں ان کے خاندانی مقبروں میں بھیجا جائے اور دوسرے یہ کہ ان کی اولاد کو قید سے آزادی مل جائے۔ افسوس کہ مظلوم بادشاہ کی کسی بھی وصیت پر عمل نہ ہو سکا۔ (15)

ویران دہلی پر قہر

دلی پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے قتل و غارت گری اور ظلم و جبر کا ایسا ننگا ناچ کیا جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ ہر چند کہ جنرل ولسن نے بچوں اور عورتوں کے خلاف تشدد پر سخت وارننگ دی تھی لیکن انگریز سپاہ نے فتح کا جشن بے رحمی اور سنگدلی کے نئے ریکارڈ قائم کر کے منایا۔ انتقام کی آگ میں سرخ انگریز فوجیوں اور ہندوستانی فسادیوں نے کسی امتیاز اور تفریق کے بغیر عوام کو قتل کیا۔

ایک انگریز مسٹر گرفتھ نے 21 ستمبر 1857 کے حالات کی یوں منظر کشی کی ہے:

> ''سڑکیں خالی اور ویران تھیں۔ دلی موت کا ایسا شہر لگ رہا تھا جہاں بہت بڑا المیہ ہوا ہو۔ اس دن شہر کے جن حصوں سے ہم گزرے، وہ مکمل طور پر تباہ ہو چکے تھے۔ ہر طرف سپاہیوں اور عام شہریوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان لاشوں سے اٹھنے والی بدبو ناقابل برداشت تھی اور کافی دنوں تک وہاں سڑتی اور فضا کو زہر آلود بناتی رہیں۔''

شہر میں ہیضہ پھیل گیا اور اسپتال مریضوں سے بھر گئے۔ پھر بھی لوٹ مار، قتل و غارتگری کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ مدفون خزانوں کی تلاش میں خالی مکانوں کے فرش اور دیواریں کھود ڈالی گئیں۔ جس نے ویرانی کو مزید بڑھا دیا۔

مرزا غالب نے اس دور کی آنکھوں دیکھی ترجمانی بڑے غم واندوہ کے ساتھ کی ہے:

> ''یہاں میرے سامنے خون کا وسیع سمندر ہے اور صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ مجھے ابھی کیا کیا دیکھنا باقی ہے۔ میرے ہزاروں دوست مارے گئے۔ کس کس کو یاد کروں اور کس سے شکایت کروں؟ شاید میری موت پر آنسو بہانے کے لئے بھی کوئی نہیں بچا ہے۔''

اپنے فارسی روزنامچے 'دستنبو' میں انہوں نے مزید لکھا ہے کہ:

> ''صرف اللہ ہی پھانسی پر چڑھائے گئے لوگوں کی تعداد جانتا ہے۔ فاتح فوج خاص راستے سے شہر میں داخل ہوئی۔ راہ میں جو بھی انہیں ملا اسے

مار ڈالا۔ گوروں نے شہر میں داخل ہونے پر معصوم اور بے گناہ لوگوں کو مارنا شروع کر دیا۔ دو یا تین محلوں میں انگریزوں نے جائیدادیں لوٹ لیں اور لوگوں کو مار ڈالا۔"

ظہیر دہلوی نے 'داستان غدر' میں حالات کی یوں منظر کشی کی ہے:

"کبھی کبھی گناہ گاروں کے ساتھ بے گناہ بھی مارے جاتے ہیں۔ بغاوت کے بعد یہی ہوا۔ انگریز سپاہیوں نے راستے میں جو بھی ملا، اسے گولی مار دی۔ شہر میں زندہ بچ گئے لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جن کا ثانی نہ کبھی تھا، نہ کبھی پیدا ہوگا۔ ایک اعلیٰ ادیب میاں محمد امین پنجہ کش، مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹے میر نیاز علی اور کوچہ چیلان کے لوگوں (کہا جاتا ہے کہ وہ 14000 تھے) کو گرفتار کر کے راج گھاٹ گیٹ میں لے جایا گیا۔ پھر انہیں گولی مار کر ان کی لاشوں کو جمنا میں پھینک دیا گیا۔ عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ گھروں سے نکل آئیں اور کنوؤں میں کود کر جان دے دی۔ کوچہ چیلان کے سبھی کنویں لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ میرے قلم میں اس سے زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں۔"

یہ پس منظر سریندر ناتھ سین کی تصنیف '1857' کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔

حوالے

1۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے خورشید مصطفیٰ رضوی کی کتاب 'تاریخ جنگ آزادی 1857'

2۔ V.D. Sawarkar: Indian war of Independence 1857, Page: 87

3۔ گارساں دتاسی، خطبات جلد اول، صفحہ: 218

4۔ تفصیلات کے لیے دیکھئے سریندر ناتھ سین کی انگریزی کتاب '1857'

5۔ Parliamentry Papers, Vol. 30, P.3 No.263

6۔ ROBERTS: 41 Years in India, P 241

7۔ 'طلسم' لکھنؤ یکم مئی 1857

8۔ سریندر ناتھ سین: **'1857'**

9۔ RUSSEL:My Diary in India Vol-2, Page 51

10۔ ظہیر دہلوی: 'داستان غدر'، صفحہ: 46تا47

11۔ ظہیر دہلوی: 'داستان غدر' صفحہ: 49تا56

12۔ 'سراج الاخبار' 23 مئی 1857

13۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا M.P. Collection No: 43 File No: 2

14۔ ذکاء اللہ دہلوی: 'تاریخ عروج انگلشیہ'، صفحہ: 721

15۔ غلام رسول مہر: 1857، ماہنامہ آجکل، ستمبر 1957

اردو صحافت کا ارتقاء

ہندوستان میں اخبار نویسی کی ابتداء کا سہرا انگریزی اخبار 'ہکیز گزٹ' کے سر ہے جو 1780 میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ یہ چار صفحوں کا ایک چھوٹا سا اخبار تھا جس میں دور و نزدیک کے نامہ نگاروں کے مکتوبات شائع ہوتے تھے اور کبھی کبھی یوروپ سے آئی ہوئی خبروں کا خلاصہ بھی دیا جاتا تھا۔ اس اخبار کی ایک ناقص فائل برٹش میوزیم لندن اور نیشنل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہے۔(1)

ہندوستان کے پہلے انگریزی اخبار کے تعلق سے یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ اس نے ابتداء سے ہی کلکتہ کے صاحبان والا شان کی پگڑیاں اچھالیں اور یہ اخبار اپنی غیر ذمہ دارانہ صحافت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اخبار میں غیر مہذب مضامین کی اشاعت، لوگوں کو بدنام کرنے اور شہر کے امن کو مکدر کرنے کی پاداش میں اس کی تقسیم پر پابندی لگا دی گئی اور اس کے اڈیٹر مسٹر ہکی کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ مارچ 1782 میں ہکی کا چھاپہ خانہ بھی بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔

ہندوستان کا پہلا انگریزی اخبار 'ہکیز گزٹ' اپنی غیر سنجیدگی اور سوقیانہ پن کی وجہ سے حالات کا شکار ہوا لیکن اس کے برعکس ہندوستان میں اردو صحافت نے پوری سنجیدگی، متانت اور ذمہ داری کے ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کیں۔ 1822 میں کلکتہ سے 'جام جہاں نما' کی اشاعت سے لے کر ملک کی آزادی تک اردو صحافت کا کردار بڑا روشن اور تابندہ ہے۔ اردو صحافت نے استعمار کی آغوش میں آنکھ کھولی اور وہ ظلم و جبر کے

ماحول میں پروان چڑھی۔ اس دوران ایسی بہت ہی کم مثالیں سامنے آئیں گی کہ اردو صحافیوں نے کسی قسم کی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہو یا سامراجی تسلط سے مرعوب ہو کر انگریزوں کا پٹھو بننے کو ترجیح دی ہو۔ اس زمانے میں ہندوستانیوں کی طرف سے جو انگریزی اخبارات نکالے گئے ان پر انگریزوں کا ہی تسلط رہا اور ان اخبارات نے دیسی زبانوں کے اخبارات کے حوصلے اور جرأت مندی پر کاری ضربیں لگائیں۔ مطبوعہ صحافت کے آغاز سے قبل جو قلمی اخبارات نکالے جاتے تھے ان میں بھی فرنگیوں کے خلاف برسرِ پیکار ہونے اور انہیں ملیامیٹ کر دینے کی اپیلیں شائع ہوتی تھیں۔ قلمی اخبارات کے بارے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید رقم طراز ہیں:

"1800 کا ذکر ہے، جنوبی ہند میں ایک شخص نے وسیع پیمانے پر قلمی اخبارات تقسیم کیے جن میں برطانوی فوج کے دیسی سپاہیوں اور عام ہندوؤں اور مسلمانوں سے پر جوش اپیل کی کہ وہ جرأت سے کام لے کر فرنگیوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو جائیں اور انہیں ملیامیٹ کر کے دم لیں۔ 1806 میں ویلور کا غدر ہوا۔ سرجان میلکم کا بیان ہے کہ اس غدر میں قلمی اخبارات کا بڑا دخل تھا۔ 1836 میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ہم پر جب کوئی نازک وقت آتا ہے، قلمی اخبار اشتعال انگیزی پر اتر آتے ہیں۔ بالخصوص جنگ برما کے دوران تو یہ حد سے گزر گئے۔ اسی سال گورنر جنرل کی کونسل کے رکن مسٹر میکالے نے ایک نوٹ میں لکھا کہ صرف دہلی سے ہر ہفتے 120 قلمی اخبار بذریعہ ڈاک باہر بھیجے جاتے تھے۔ اس کے مقابلے پر مطبوعہ دیسی اخبارات کی کل ہفتہ وار اشاعت 300 تھی۔ انہوں نے بتایا کہ مطبوعہ دیسی اخبار تو پھر بھی احتیاط سے کام لیتے ہیں لیکن قلمی اخبار اکثر ہمیں اور ہمارے عہد کو برا بھلا کہتے ہیں اور ہمارے قومی کردار اور اطوار پر طنزیہ نکتہ چینی کرتے ہیں۔" (2)

انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد یہاں کے باشندوں کے

ساتھ جو رویہ اختیار کیا وہ توہین آمیز تھا۔ انہوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کیا اور ہندوستان کی دولت وحشمت کو بے دریغ لوٹنے لگے۔ جس کے نتیجے میں مقامی باشندوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑکے۔ اخبارات نے جب اس نفرت اور عداوت کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کی تو عام لوگوں کو ایسا محسوس ہوا کہ انہیں اپنے دل کا درد بیان کرنے کے لئے زبان مل گئی ہے۔ اس دور کے اخبارات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا لب و لہجہ باغیانہ اور تیور خطرناک تھے۔ بقول عتیق صدیقی:

''انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستانیوں نے فارسی، بنگلہ، اردو، ہندی اور انگریزی اخبار جاری کرنا شروع کیے۔ یہ سیدھے سادے معصوم اصلاحی اخبار ہوتے تھے۔ ان میں خبریں بھی ہوتی تھیں مگر بظاہر غیر سیاسی قسم کی۔ لیکن ان کے انداز بیان اور ان کے مواد کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کی گہرائی میں غم و غصے کے دبے ہوئے طوفان نظر آئیں گے۔ ابتدائی دور کے اخباروں میں راجہ رام موہن رائے اور ان کے ساتھیوں کے فارسی اور بنگلہ اخبارات نیز رجب علی لکھنوی کا ''سلطان الاخبار'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔''(3)

1857 سے قبل فارسی اور دیگر علاقائی زبانوں کے اخبارات کا لہجہ ہر چند کہ انگریزوں کے خلاف تھا اور ان کی تحریروں میں غم و غصے کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں لیکن 1857 کی جنگ آزادی نے ان اخبارات کو ایک نیا حوصلہ اور جوش عطا کیا اور بالخصوص اردو اخبارات نے اس موقع پر شدید مزاحمت کی روش اختیار کی۔ یہی باغیانہ روش آزادی کی تحریک کو منطقی انجام تک پہنچانے کا وسیلہ بنی۔ تحریک آزادی کو پروان چڑھانے میں اردو صحافت کا کردار عام زبانوں کی صحافت سے زیادہ روشن اور تابندہ ہے۔ بزرگ صحافی رئیس الدین فریدی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''1857 سے لے کر 35-1930 تک ملک گیر پیمانے پر آزادی اور قومی اتحاد کے لیے جنگ کرنے کا سہرا زیادہ تر اردو اخبارات کے سر رہا کیونکہ ہندی

کے اخبار اس زمانے میں برائے نام ہی تھے۔ انگریزی کے اکثر اخبار انگریزوں
کے ہم نوا تھے اور علاقائی زبانوں کے اخباروں کا حلقہ اثر محدود تھا۔'' (4)

1857 کے جنوری تا ستمبر کے مختلف اردو اخباروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے آسمان پر 1857 کے اوائل ہی سے بغاوت کے بادل جمع ہونے لگے تھے اور ساتھ ہی ہمارے اخباروں کا لہجہ تلخی کی حد تک تندو تیز ہونے لگا تھا۔ 1857 میں اردو صحافت نے جو بے مثال کردار ادا کیا اس کو تمام مؤرخین نے خراج تحسین پیش کیا اور اردو صحافت کو جنگ آزادی 1857 کا ہراول دستہ قرار دیا ہے۔ عتیق صدیقی نے لکھا ہے کہ:

''اس ملک گیر بغاوت کو بروئے کار لانے میں جن عناصر نے حصہ لیا تھا ان میں
ہندوستانی اخبار نویسی کی حیثیت شریک غالب کی تھی، جس کی عمر اس وقت تیس
پینتیس سال سے زیادہ نہ تھی لیکن ہندوستانی اخبار نویسی کے اس مختصر عہد کی تاریخ
کا اگر تجزیہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ابتداء سے ہی اس کا مزاج باغیانہ تھا۔'' (5)

ہندوستانی اخبار نویسی کے ابتدائی دور (1822-1857) کا اگر جائزہ لیا جائے، جو بڑی حد تک فارسی اور اردو اخبار نویسی کا دور تھا تو اس کی گہرائی میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف نفرت و عداوت کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس کا نقطہ عروج 1857 کے اوائل کا زمانہ تھا جبکہ ہندوستانی اخباروں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف بغاوت کے جذبات عام کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ بغاوت شروع ہونے کے بعد گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اپنی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس حقیقت کا واضح الفاظ میں اعتراف بھی کیا تھا:

''دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کے پردے میں ہندوستانی باشندوں
کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دئے ہیں۔ یہ کام
بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری سے انجام دیا گیا ہے۔'' (6)

1857 کے اوائل ہی سے ہندوستان کے آسمان پر بغاوت کے بادل منڈلانے

لگے تھے، اوراس کے ساتھ ہی ہندوستانی اخباروں نے تلخی و بے باکی کے ساتھ انگریزی حکومت پر نکتہ چینی کی رفتار بھی تیز کر دی تھی۔ اس سلسلے میں دہلی لکھنؤ اور کلکتہ کے اخبارات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ کلکتہ اور ممبئی کے انگریزی اخباروں نے جو سب کے سب کمپنی کے ہمنوا تھے، دیسی اخباروں کی روش پر پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے حکومت کو اس طرف توجہ دلائی حتیٰ کہ بعض انگریزی اخبارات نے تو دیسی اخباروں کی آزادی سلب کرنے کی پرزور وکالت کی اور اس ذیل میں ہندوستانیوں کے لیے ایک علاحدہ قانون بنانے کا مشورہ دیا۔ 'صادق الاخبار' دہلی کے بیان کے مطابق:

''اخبار مفصلائٹ آگرہ و ممبئی گزٹ و دیگر اخبارات انگریزی نے بہت رشک سے لکھا ہے کہ ہندوستانی اخبار والوں کو آزادی پریس نہیں دینی چاہئے کیونکہ یہ لوگ اس کی قدر نہیں جانتے اور کبھی ایسی آگ لگا دیتے ہیں کہ بجھائے نہیں بجھتی...... پس جس طرح اور باتوں میں انگریز اور ہندوستانیوں کے لئے دو قانون ہیں، اسی طرح اس باب میں بھی چاہئے۔'' (7)

پہلا اردو اخبار

اگرچہ اٹھارہویں صدی میں برعظیم کے وسیع علاقوں میں اردو بولی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود فارسی زبان علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول تھی اور علمی شہ پارے اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس برعظیم کے وسیع خطوں میں عمل دخل حاصل ہوا تو اس نے اپنے استحکام کے لئے یہ ضروری خیال کیا کہ جو ثقافتی علامات پرانے نظام کی یاد تازہ کرتی ہیں، انہیں آہستہ آہستہ ختم کر دیا جائے۔ بقول محمد عتیق صدیقی:

''انیسویں صدی کے اوائل میں ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں عملاً وہ مرکزی حیثیت حاصل کر لی تھی جو اب تک اس ملک میں مغل حکمرانوں کی تھی۔ اپنی اس امتیازی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے کمپنی نے یہ ضروری سمجھا کہ فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کر دی جائے جو مغل دور کی یادگار تھی۔

> چنانچہ 1830 میں فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس اقدام کا قدرتاً اردو کی نشوونما پر خوشگوار اثر ہوا۔ عدالتوں میں فارسی کی جگہ اب اردو میں کام ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی اردو زبان کے اخباروں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔''(8)

اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کے انقلابی قدم کے پیچھے ایسٹ انڈیا کمپنی کی اردو دوستی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس نے اردو کی حوصلہ افزائی اس لئے کی کہ اس سے اس کے مفادات کی تکمیل ہوتی تھی۔ فارسی عام فہم زبان نہیں تھی اور اردو ہندوستانی بول چال سے بے حد قریب تھی اس لئے کمپنی کو اپنے کام کاج کے لئے اردو کا سہارا لینا پڑا۔

صحافت کی مجموعی ترقی میں دوسرا بڑا عنصر یہ تھا کہ 1835 میں سر چارلس مٹکاف نے اخبارات کو مختلف پابندیوں سے آزاد کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبانوں میں کئی اخبار نکل آئے۔ ان زبانوں میں اردو سرفہرست تھی کیونکہ اسے سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔

کلکتہ کے 'جام جہاں نما' کو اردو کا پہلا اخبار تسلیم کیا گیا ہے۔ جس کی اشاعت 1822 میں شروع ہوئی تھی لیکن اس نظریہ کے استحکام سے قبل ہندوستان میں اردو صحافت کا موجد ٹیپو سلطان کو سمجھا جاتا تھا۔ اردو صحافت کے معتبر محققین نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کلکتہ کا 'جام جہاں نما' ہی اردو کا پہلا اخبار تھا جس کے مالک ہری ہردت اور مدیر سدا سکھ لعل تھے۔ جی ڈی چندن نے تو اس موضوع پر 'جام جہاں نما' کے عنوان سے ایک ضخیم تحقیقی کتاب قلم بند کی ہے۔ اس کے حوالے سے ہم اردو صحافت کی ابتداء سے متعلق آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ ٹیپو سلطان کو اردو صحافت کا موجد کیوں خیال کیا جاتا ہے۔ معروف صحافی اور محقق شمیم طارق نے لکھا ہے کہ:

> ''اب تک کی تحقیق تو یہی تھی کہ کلکتہ کا 'جام جہاں نما' اردو کا پہلا اخبار تھا جو 1822 میں شائع ہوا۔ عبدالسلام خورشید اور عتیق صدیقی نے بھی اسے تسلیم کیا ہے مگر اب جو آثار ملے ہیں ان کی روشنی میں سرنگاپٹنم سے شائع ہونے والا 'فوجی اخبار' اردو کا پہلا اخبار ہے۔

ٹیپو سلطان 1782 میں اپنے والد حیدر علی کے انتقال کے بعد سلطنت خداداد کے فرماں روا ہوئے اور 1799 میں شہادت سے سرخرو ہوئے۔ یہ وہ دور ہے جب مشرق وسطیٰ سے فرانسیسیوں کی سرپرستی میں اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ 1799 تا 1800 قسطنطنیہ کے فرانسیسی مطبع نے ان اعلامیوں، خبرناموں اور اعلانوں کی اشاعت شروع کر دی تھی جو فرانسیسی سفارت خانے کی طرف سے جاری ہوتے تھے۔ ٹیپو سلطان اور فرانسیسیوں میں خاص روابط تھے۔ اس کے علاوہ عبداللہ یوسف علی کی تحقیق کے مطابق ہندوستان کا پہلا انگریزی اخبار James Augustus Hicky کا تھا اور 'ہکینز بنگال گزٹ' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ اخبار 1780 میں جاری ہوا تھا۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ انگریزی اخبار کے ردعمل میں فرانسیسیوں سے تحریک پا کر ٹیپو سلطان نے اخبار شائع کیا ہو۔ اس اعتبار سے اردو کے 'فوجی اخبار' کو برصغیر کی ہر زبان کے اخبارات میں اولیت حاصل ہے۔" (9)

اس موضوع پر طویل بحث کرتے ہوئے گربچن چندن نے لکھا ہے کہ:

"اردو کے اولین اخبار کے بارے میں ہمارے یہاں ایک دعویٰ اور بھی ہے، اس کے مطابق اردو کا سب سے پہلا اخبار اٹھارہویں صدی کے اواخر میں 1794 کے آس پاس میسور کے حکمراں ٹیپو سلطان نے جاری کیا اور اس کا نام 'فوجی اخبار' تھا۔" (10)

جن دیگر شخصیات نے ٹیپو سلطان کے 'فوجی اخبار' کو اردو کا پہلا اخبار قرار دیا ہے ان میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (مضمون 'اردو کا سب سے پہلا اخبار اور ٹیپو سلطان' رسالہ بصائر جنوری، اپریل و جولائی 1964) کے علاوہ ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب 'ہسٹری آف اردو لٹریچر' قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں 'ہماری زبان' علی گڑھ یکم جولائی 1957 میں بھی اس موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ دراصل ٹیپو سلطان کو اردو صحافت کا موجد قرار دینے کا نظریہ سب سے پہلے محمد سعید عبدالخالق نے پیش کیا تھا۔ بقول ان کے:

''فوجی اخبار' ایک ہفتہ وار اخبار تھا جو میسور کے سرکاری پریس میں چھپتا تھا۔ اس کی تقسیم سلطان کی فوج تک محدود ہوتی تھی۔ اس اخبار میں فوجی خبروں اور احکام وغیرہ کے علاوہ انگریزوں کی شکایت اور فرانسیسیوں کی تعریف ہوتی تھی۔ یہ مطبع ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ضبط کرلیا گیا اور جہاں کہیں اس اخبار کے نسخے دستیاب ہوئے انہیں تلف کر دیا گیا۔'' (11)

ٹیپو سلطان کو اردو صحافت کا موجد قرار دینے والے محمد سعید عبدالخالق کی تصنیف 'میسور میں اردو' کا مطالعہ کرنے کے بعد گربچن چندن نے لکھا ہے کہ:

''80 صفحات کی یہ چھوٹی سی کتاب جس کے مصنف اس کی تصنیف کے وقت حیدرآباد (دکن) میں ایک طالب علم تھے، حقیقتاً کمیاب ہے۔ خاصی تلاش کے بعد مجھے اس کا نسخہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مصنف کا ماخذ بنگلور کے ایک عمر رسیدہ بزرگ کی اپنے مرحوم دادا کی روایت ہے جس کی تائید میں انہوں نے کوئی مستند شہادت یا دستاویزی حوالہ پیش نہیں کیا بلکہ خود یہ تاثر دیا ہے کہ آج اس اخبار کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہے، کیونکہ بقول مصنف ''انگریزوں نے 1799 میں فتح میسور کے بعد اس کا تمام ریکارڈ تلف کر دیا تھا۔'' (12)

کتاب کے مصنف کا دعویٰ ہے کہ ٹیپو سلطان کا 'فوجی اخبار' قریب پانچ سال تک چھپتا رہا۔ گربچن چندن نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ سرکاری اہتمام سے اتنی مدت تک چھپنے والے اور افواج کے کئی دستوں میں تقسیم ہونے والے اس ہفت روزہ اخبار کے تقریباً ڈھائی سو شماروں میں سے کوئی ایک شمارہ بھی کسی سرکاری دفتر یا نجی ذخیرے میں نہ رہ سکا۔ نہ صرف مصنف نے اس کے کسی شمارے کا کوئی حصہ یا عکس پیش نہیں کیا بلکہ کسی عصری مشاہد یا اخبار یا کسی اور مؤرخ یا محقق کا کوئی حوالہ بھی شامل نہیں کیا۔ بقول گربچن چندن صرف ایک گمنام عمر رسیدہ بزرگ کی سند پر اپنا دعویٰ قائم کرلیا اور اس طریقہ کار میں واقعات نگاری سے زیادہ افسانہ طرازی کارفرما ہے۔ گربچن چندن نے اس سلسلہ میں یہ حتمی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''صحافت کی ہماری معروف تاریخیں بھی ٹیپو سلطان کے 'فوجی اخبار' کے بارے میں خاموش ہیں۔ ٹیپو سلطان کے عہد میں میسور کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ حکومت کے تمام فرمان، احکام اور مراسلات فارسی زبان میں تحریر ہوتے تھے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ انہوں نے کوئی اخبار جاری کیا ہو تو وہ سرکاری زبان فارسی میں ہو۔ بہر حال اس کا بھی کوئی شمارہ یا اقتباس ہمیں دستیاب نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک سرکلر قسم کی کوئی چیز ہو یا سلطان کی طرف سے کبھی کبھار کوئی مراسلہ جاری ہوا ہو جس میں فوج کے نام ان کے احکام درج کئے جاتے ہوں اور اس لئے اس کی تقسیم سرکاری ہدایات ہی کے تحت محدود رہی ہو۔ ایک اور ممکنہ صورت یہ بھی ہے کہ ٹیپو سلطان نے جن کا تقریباً سارا عہد جنگ و جدل میں گزرا، اپنی افواج کی فوجی مشقوں کے لئے ہدایات یا قواعد کا کوئی قلمی پرچہ یا گائیڈ تیار کروایا ہو اور اس کی نقلیں بار بار فوج میں تقسیم کی گئی ہوں۔ بہر حال ان کا بھی کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آیا۔ بہر حال جب تک کسی مصدقہ یا مستند ذرائع سے ٹیپو سلطان کے مبینہ 'فوجی اخبار' کی تصدیق نہ ہو، اسے تسلیم کر لینا صداقت کے حق میں نہیں۔'' (13)

گربچن چندن نے ٹیپو سلطان کے 'فوجی اخبار' کی اصلیت جاننے کے لئے کافی تگ و دو کی لیکن اس تک ان کی رسائی نہیں ہوسکی۔ ہر چند کہ یہ موضوع ہماری تحقیق کا نہیں ہے تاہم اس بات کی ضرورت باقی ہے کہ ٹیپو سلطان کو اردو صحافت کا موجد قرار دینے کی جو کوشش کی گئی ہے اس پر مزید تحقیق کی جائے کیونکہ جہاں تک 'فوجی اخبار' کے شماروں کی عدم دستیابی کا سوال ہے تو اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ انگریزوں نے اپنے اقتدار کو چیلنج کرنے والی تمام دستاویزوں اور اخباروں کو تلف کر دیا تھا۔ یہی دعویٰ 'فوجی اخبار' کے بارے میں بھی کیا گیا ہے اس لئے 'فوجی اخبار' کے کسی شمارے کا دستیاب نہ ہونا اس کے عدم اجراء کا ثبوت نہیں ہے۔ شمیم طارق کا کہنا ہے کہ انہوں نے شرنگا پٹنم میں ایک صاحب کے پاس اس کے شمارے دیکھے تھے۔ شمیم طارق کے مطابق اس پر تو

بحث ہو سکتی ہے کہ 'فوجی اخبار' مکمل اخبار تھا یا نہیں کیونکہ اس میں فوجیوں کے لئے ہدایات ہوتی تھیں، مگر اس کا وجود تو تھا۔

ہم یہاں خصوصی طور پر مرزا بیدار بخت کے اخبار 'پیام آزادی' کا ذکر کرنا چاہیں گے۔جس کی تفصیلات اس کتاب میں آگے چل کر آئیں گی کیونکہ آج دنیا میں اس کا کوئی ایک شمارہ بھی کہیں دستیاب نہیں ہے۔ پیام آزادی کے بارے میں سر ہنری کاٹن نے اپنی کتاب INDIAN AND HOME MEMORIES میں لکھا ہے کہ ''انگریزوں نے 1857 کے بعد جب از سر نو دہلی پر قبضہ کیا، تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سبھی لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا جن کے گھروں میں 'پیام آزادی' کا ایک شمارہ بھی برآمد ہوا۔''

اردو صحافت کی ابتداء سے متعلق ایک نظریہ نادم سیتا پوری نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

> ''اردو اخبار نویسی کا آغاز 1810 میں کلکتہ کے اردو اخبار سے ہوا جسے فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کے ایک ممتاز اور نامور رکن مولوی اکرام علی (مترجم اخوان الصفاء) نے جاری کیا تھا۔ فارسی 'جام جہاں نما' کا اردو ضمیمہ۔ مولوی محمد باقر دہلوی کا اردو اخبار اور ماسٹر رام چندر دہلی کے رسائل یہ سب اردو اخبار کلکتہ کے بعد کی پیداوار ہیں۔'' (14)

نادم سیتا پوری کے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 'جام جہاں نما' کا اردو ضمیمہ 'اردو اخبار' کے نام سے 1810 میں ہی منظر عام پر آ گیا تھا جبکہ محققین نے متفقہ طور پر 'جام جہاں نما' کے اردو ایڈیشن کے اجراء کی تاریخ 1822 درج کی ہے۔

بہر کیف اب تک اردو صحافت کے بیشتر مؤرخین نے اپنی تحقیق میں کلکتہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار 'جام جہاں نما' کو ہی اردو کا پہلا اخبار تسلیم کیا اور اس سلسلے میں سب سے تازہ تصنیف ڈاکٹر طاہر مسعود کی ہے جنہوں نے تحقیقات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> ''اردو صحافت کے محققوں میں ایک مدت کی تحقیق و تفتیش اور بحث و نزاع

کے بعد اب اس رائے پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ 'جام جہاں نما' اردو کا پہلا اخبار ہے۔ اس انکشاف میں تاخیر کا سبب یہ ہوا کہ 'جام جہاں نما' جو 27 مارچ 1822 کو پہلی بار منظر عام آیا تھا چھ شماروں کی اشاعت کے بعد خریداروں کی بے التفاتی کی وجہ سے اپنی زبان تبدیل کرنے پر مجبور ہو گیا اور جون 1822 سے فارسی میں نکلنے لگا۔ اخبار کے مذکورہ چھ شمارے بھی دست برد زمانہ سے تلف ہو گئے۔ ان شماروں کی عدم دستیابی کی وجہ سے تقریباً سوا صدی تک اردو صحافت کی ابتداء کے بارے میں مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کی جاتی رہیں۔" (15)

'جام جہاں نما' کے اجراء کے بارے میں عبدالسلام خورشید نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے 'جام جہاں نما' کے اجراء سے متعلق کلکتہ جرنل کی 1822 کی فائل کی جلد اول صفحہ 395 سے مندرجہ ذیل اقتباس نقل کیا ہے جو ہم عصر اخبار 'جان بل' سے لیا گیا ہے۔

"آج صبح ایک نیا اخبار ہندوستانی زبان میں جاری ہوا ہے لیکن اس کا رشتہ کس سے ہے؟ اسے کس نے جاری کیا؟ اس بارے میں ہمیں کوئی بھی کچھ نہیں بتا سکتا۔ نہ اس کا کوئی پراسپیکٹس ہے نہ اس پر چھاپنے والے کا نام درج ہے۔ یہ اخبار کوارٹر سائز کے تین ورق پر مشتمل ہے اور اس کا نام 'جام جہاں نما' ہے۔ پہلا شمارہ بدھ کے دن 27 مارچ کو شائع ہوا۔"

اس اقتباس کی روشنی میں عبدالسلام خورشید نے جو دعویٰ کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ 'جام جہاں نما' ہندوستانی یعنی اردو زبان میں جاری ہوا تھا اور تاریخ اجراء 27 مارچ 1822 تھی۔ چونکہ کلکتہ جرنل 'جام جہاں نما' کا ہم عصر تھا، اس لئے 'جام جہاں نما' کی زبان اور تاریخ اجراء کے سلسلے میں اس کا بیان قطعی طور پر درست تسلیم کرنا پڑے گا۔

حوالے

1۔ 'ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں'، صفحہ:64

2۔ 'صحافت پاکستان و ہند میں'، صفحہ:124

3۔ 'ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں'، صفحہ:359

4۔ آجکل، نومبر دسمبر 1983

5۔ 'اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں'، صفحہ:13

6۔ M.Donogh: HIstory of law and sedation page183

7۔ 'صادق الاخبار'، 20 اپریل 1857

8۔ 'ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں'، صفحہ:263

9۔ شمیم طارق: 'روشن لکیریں' ممبئی، 1998، صفحہ:80

10۔ گربچن چندن: 'جام جہاں نما' صفحہ:24

11۔ 'میسور میں اردو' مطبوعہ حیدرآباد، 1942، صفحہ:77-74

12۔ ایضاً

13۔ گربچن چندن: 'جام جہاں نما'، صفحہ:28

14۔ ماہنامہ 'العلم' کراچی، اکتوبر تا دسمبر 1971

15۔ 'اردو صحافت انیسویں صدی میں'، صفحہ:130

دہلی اردو اخبار

1857 کی جنگ آزادی میں سرفروشانہ کردار ادا کرنے والے اخباروں میں سب سے نمایاں اور جلی نام 'دہلی اردو اخبار' کا ہے، جسے مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے جاری کیا تھا۔ دہلی 'اردو اخبار' کو 1857 کی تحریک میں اس لئے بھی اہمیت دی جاتی ہے کہ انگریزوں نے مولوی محمد باقر کو گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔

ہرچند کہ مولوی محمد باقر کی شہادت کے لئے بعض دوسرے عوامل کو بھی ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے لیکن اردو صحافت کے لئے اس سے بڑا فخر اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس نے ملک کی آزادی کے لئے اتنی بڑی قربانی پیش کی۔ 'دہلی اردو اخبار' محض سیاسی خبروں سے ہی مزین نہیں تھا بلکہ اس دور کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا بھی بھرپور عکس اس میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ بقول خواجہ احمد فاروقی:

> ''دہلی اردو اخبار' شاہجہاں آباد دہلی کا پہلا اردو اخبار ہے جس کے مطالعہ سے مومن و غالب، شیفتہ و آزردہ اور ذوق وظفر کا سارا ماحول اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور ہم اس جام جم میں دو دنیاؤں کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں جس میں ایک ابھرتی ہوئی ہے، دوسری ڈوبتی ہوئی۔'' (1)

'دہلی اردو اخبار' کا اجراء

'دہلی اردو اخبار' کی تاریخ اجراء سے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

مارگریٹا بارنس نے اس کے اجراء کا سال 1838 درج کیا ہے جبکہ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی نے اس کی تاریخ اجراء 1837 قرار دی ہے۔لیکن خود مولوی محمد باقر کے فرزند مولانا محمد حسین آزاد جواس اخبار سے وابستہ تھے،اس کا سنہ اشاعت 1835 بتاتے ہیں۔

> ''1835 سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہوگئی۔اس شہر میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔1836 میں اردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان کا پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا۔''(2)

مولانا محمد حسین آزاد کا بیان اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ وہ خود مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے اور اس اخبار سے وابستہ رہ چکے تھے لیکن ان کا یہ کہنا کہ یہ اردو کا پہلا اخبار ہے، درست نہیں۔اردو کے پہلے اخبار کے تعلق سے ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'دہلی اردو اخبار' اپنے آپ میں اردو کا پہلا مکمل ہفتہ وار اخبار تھا جس کے ذریعہ ہمیں اس عہد کی سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ادبی اور علمی سرگرمیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے اور مرزا غالب کے ایک خط کے ذریعہ ہی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ 'دہلی اردو اخبار' 1837 میں ضرور نکل رہا تھا۔وہ چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

> ''جناب چودھری صاحب، آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے، یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔ تفصیل یہ ہے کہ مولوی محمد باقر کے مطبع میں سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا ہے۔ مسمیٰ بہ اردو اخبار۔ بعض اشخاص سنین ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے کسی دوست کے یہاں جمع چلے آتے ہوں تو اکتوبر 1837 سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھے جائیں جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر مندرج ہو۔ بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا بعینہ میرے پاس بھیج دیجئے۔''

محققین نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ 'دہلی اردو اخبار' 1836 میں نکلنا شروع ہوا۔اس سلسلے میں قاسم علی، سجن لال، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور امداد صابری کی

رائے یکساں ہے۔ دہلی اردو اخبار کی اہمیت محض ایک اخبار کی ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ذکر غالبؔ کے خطوں کے علاوہ بہادر شاہ کے مقدمے اور گارساں دتاسی کے لیکچروں میں بھی موجود ہے، جو اس کی اہمیت کے شاہد ہیں۔ اس سے زبان وادب کی رفتار بھی معلوم ہوتی ہے اور تاریخ کے بہت سے گوشے ڈائری کی شکل میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ واضح رہے کہ دہلی اردو اخبار کے شمارے نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی کے علاوہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد یا ذخیرہ قاسم علی سجن لال، عثمانیہ یونیورسٹی اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔

'دہلی اردو اخبار' ہفتہ وار 30×20 کے سائز پر شائع ہوتا تھا۔ ماہانہ قیمت 2روپے اور زر سالانہ 20روپے تھا۔ اس کا پہلا نام 'اخبار دہلی' تھا لیکن 10 مئی 1840 (نمبر 168 جلد نمبر 3) سے اس کا نام 'دہلی اردو اخبار' ہوگیا۔ نام کی تبدیلی کے ساتھ کاغذ قدرے سفید اور کتابت قدرے جلی اور کشادہ ہوگئی۔ 12 جولائی 1857 کو نمبر 28 جلد 19 سے اس کا نام بہادر شاہ ظفر کے حکم پر 'اخبار الظفر' کردیا گیا۔ اخبار کا نمبر اور جلد کا شمار وہی رہا جو 'دہلی اردو اخبار' کا تھا، اور یہ کھل کر انگریزوں کی مخالفت اور بہادر شاہ ظفر کی حمایت کرنے لگا لیکن جنگ آزادی کی ناکامی مغلیہ سلطنت کی تاراجی کے ساتھ بالآخر اس اخبار کی زندگی بھی 13 ستمبر 1857 کو ختم ہوگئی۔

دہلی اردو اخبار کے مالک و مدیر مولانا محمد باقر، شیخ ابراہیم ذوقؔ کے ارادت مندوں میں تھے۔ وہ علم و فضل میں ہی یکتا نہ تھے بلکہ دربار شاہی میں بھی انہیں بڑا عمل دخل حاصل تھا۔ خواجہ احمد فاروقی نے چندن لال کے روزنامچہ 1857 کے اصل نسخہ کا لندن میں مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

> ''اس میں کئی جگہ مولوی محمد باقر کی باریابی حضور کا ذکر ہے اور ان ہدایات کی صراحت ہے جو انہوں نے بادشاہ کے دستوں کو خزانہ شاہی کی حفاظت کے سلسلے میں دی تھیں۔''(3)

مولوی محمد باقر شیعہ مجتہد تھے اور وہ دہلی کالج میں استاد رہ چکے تھے۔ انہوں نے

پرنسپل ٹیلر کو فارسی پڑھائی تھی اور ان کی مشنری سرگرمیوں سے واقف تھے۔

'دہلی اردو اخبار' کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سررشتہ داری اور تحصیل داری کے علاوہ محکمہ بندوبست میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر بھی کام کر چکے تھے۔ خواجہ احمد فاروقی نے 1857 کے تعلق سے اس اخبار کی پالیسی پر یوں رائے زنی کی ہے:

> ''1857 کی بغاوت سے قبل اس اخبار کا رویہ انگریزوں کے خلاف معاندانہ نہیں، متحیرانہ تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کی حیرت، مخالفت میں بدل گئی۔''(4)

'دہلی اردو اخبار' نے اپنے 24 مئی 1857 کے شمارے میں مولانا محمد حسین آزاد کی نظم تاریخ انقلاب افزاء شائع کی تھی جس کے چند منتخب اشعار ہم آگے چل کر نقل کریں گے۔ آیئے یہ دیکھیں کہ 'دہلی اردو اخبار' میں انقلاب 1857 نے جو تبدیلی پیدا کی، وہ کیا تھی۔ 31 مئی 1857 کے اخبار میں مولوی محمد باقر لکھتے ہیں:

> ''انگریزوں کے تکبر نے ان کو قہر الٰہی میں مبتلا کیا ہے۔ ان اللہ لا یحب المتکبرین۔ اب کہاں ہیں انگلش مین اور فرینڈ آف انڈیا......اور وہ لن ترانیاں۔ حکمت وحکومت داناؤں انگلستانیوں کی ......۔''

محمد عتیق صدیقی نے دہلی اردو اخبار، کی اس پالیسی کا تجزیہ کیا ہے جو 1857 کی تحریک سے قبل تھی اور عین تحریک شروع ہونے کے بعد تبدیل ہوئی۔ اس کی پالیسی اور لب ولہجہ میں رونما ہوئی تبدیلی کے تعلق سے وہ رقم طراز ہیں:

> ''بغاوت شروع ہونے کے وقت تک اس کا انداز اور اخباروں کے برعکس 'امن پسندانہ' تھا۔ خبروں کے انتخاب اور ان کے پیش کرنے کا طریقہ سیدھا سادا ہوتا تھا۔ کسی خبر سے نہ تو انگریز دشمنی کی بو آتی تھی، اور نہ کسی قسم کی بے اطمینانی ہی کا اظہار ہوتا، بلکہ بسا اوقات تو دیسی اخباروں میں شائع ہونے والی 'گرم' خبروں کی تردید کر دینا بھی وہ ضروری سمجھتا تھا۔''(5)

محمد عتیق صدیقی نے اپنی اس رائے کے استدلال میں 'دہلی اردو اخبار' اشاعت 12 اپریل 1857 کے شمارے کی خبر کا اقتباس پیش کیا ہے جو بارک پور کے واقعے سے متعلق ہے:

''یہ مقام ہے غور اور قیاس کا کہ عوام اور بازاری لوگ جو گپ ہانکتے تھے اور شہر میں لوگوں کی زبان پر تھا کہ بہتیری سپاہ برگشتہ ہو رہی ہے اور مقابلہ کو موجود ہے، سراسر وہ باتیں لغو اور بے اصل تھیں۔ اس قسم کی بہتیری خبریں درباب لکھنؤ اور جنگ ایران وغیرہ امور ہر روز نئی طرح کے سنے جاتے تھے بلکہ لکھے آتے ہیں، لیکن اصلی تحقیق قابل حکم قطعی وتصدیق نہیں ہوتے۔''(6)

محمد عتیق صدیقی نے اپنی کتاب 'اٹھارہ سو ستاون' اخبار اور دستاویزیں' میں بغاوت شروع ہونے کے بعد کے 'دہلی اردو اخبار' کے دو شماروں کا مکمل متن شائع کیا ہے جس میں مذکورہ اقتباس بھی شامل ہے۔ انہوں نے ان شماروں کے مطالعہ کی روشنی میں 'دہلی اردو اخبار' کو عالم حیرت میں مبتلا پایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''دہلی میں یہ بغاوت کا ابتدائی زمانہ تھا اور اس کا بھی امکان تھا کہ میرٹھ کی بچی کھچی انگریزی فوج دہلی پر چڑھ دوڑے اور انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو جائے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ 'دہلی اردو اخبار' کے ان دونوں شماروں میں انگریزوں کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو قابل گرفت ثابت ہوتی ہو۔''(7)

بغاوت شروع ہونے کے دو ہفتے بعد جب حالات میں بہ ظاہر ٹھہراؤ پیدا ہوا اور 'دہلی اردو اخبار' کے اڈیٹر کو بھی اس بات کا یقین ہو چلا کہ ''انگریز اگر ہزار بلکہ لاکھ طرح کے بہروپ بھریں، اب کسی طرح نہیں پنپتے، کیونکہ خدا کی مار کو کوئی نہیں سنوار سکتا۔'' تو پھر 'دہلی اردو اخبار' کی روش میں یکایک انقلاب آ گیا۔

انقلاب کا آغاز 10 رمئی کو میرٹھ کے سپاہیوں کی بغاوت سے ہوا۔ 11 رمئی کو یہ سپاہی دہلی پہنچے۔ جس کے بعد راجدھانی دہلی شورش و ہنگامے کی لپیٹ میں آ گئی۔

17 مئی کو ہفتہ وار 'دہلی اردو اخبار' کا شمارہ منظر عام پر آیا تو اس کے صفحات انقلاب کی خبروں سے لبریز تھے۔ صفحہ اول پر انقلاب کی خبر کا عنوان اور اس کا ابتدائیہ قرآنی آیات سے شروع ہوا تھا۔ خبر کا عنوان تھا "قل فاعتبروا یا اولی الابصار" (عبرت ہے دیکھنے والی آنکھ کے لیے) خبر کے آغاز میں جو قرآنی آیات درج تھیں اور بعد ازاں اڈیٹر نے اپنی زبان میں جو تمہید باندھی تھی، اس میں خدا کی بزرگی اور برتری کے اعلان اور عزت و ذلت عطا کرنے میں اس کے بے پایاں اور لامحدود اختیارات کے اعتراف کے بعد انسانوں کی غفلت اور گمراہی کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور پھر انگریزوں کی حکومت و طاقت کے خلاف ہونے والے عظیم معرکے کو موضوع بنایا گیا تھا، ملاحظہ ہو:

> "وہ حکام ظاہر الاستحکام جن کے استقلال حکومت و انتظام کے زوال کا نہ ان کو خیال تھا اور نہ کسی غفال کو وہم و گمان کبھی آ سکتا تھا ایک طرفۃ العین میں وہ نمایاں ہو گیا۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اچانک برپا ہونے والے اس انقلاب نے 'دہلی اردو اخبار' کے اڈیٹر مولوی محمد باقر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ انقلاب برپا ہو سکتا ہے اور وہ فرنگی جو عملی طور پر ہندوستان کے سیاہ و سفید کے مالک بنے بیٹھے تھے اتنے مجبور و بے بس ہو گئے ہیں کہ مشتعل اور بپھرے ہوئے ہندوستانیوں کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچ رہے ہیں۔

دہلی اردو اخبار کے 17 مئی 1857 کے شمارہ میں مذکورہ تمہید کے بعد بغاوت کی ابتداء اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کی تفصیل دی گئی تھی۔ رپورٹنگ کا اسلوب معروضی تھا اور ہر واقعات کی جزئیات تک ریکارڈ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ساری معلومات اڈیٹر نے خوش سلیقگی اور محنت سے ترتیب دی تھیں اور واقعات بیان کرنے میں قصہ گوئی کا انداز تھا۔

> "11 مئی 57 مسیحائی کو بباعث موسم گرما اول وقت کچہری ہو رہی تھی۔ صاحب مجسٹریٹ عدالت میں سرگرمِ حکمرانی تھے اور سب حکام اپنے اپنے محکموں میں سرگرم اجرائے احکام تھے اور حکم قید اور حبس

سزائے جسمانی و طلبی مجرمین وغیرہ جاری ہو رہی تھی کہ سات بجے کے بعد میر بحری یعنی داروغہ پل نے آن کر خبر دی کہ صبح کو چند ترک سوار چھاؤنی میرٹھ کے پل سے اوتر کر آئے اور ہم لوگوں پر ظلم زیادتی کرنے لگے اور محصول مجتمعہ کا لوٹنا چاہا۔ میں نے بہ لطائف الحیل ان کو باتوں میں لگایا اور کشتی لب پل کی قفلی کھول دی کہ آگے نہ آ سکے۔ وہ لوگ جو آئے تھے انھوں نے محصول گھر سڑک کا اور بنگلہ صاحب کا کہ واقع سڑک سلیم پور ہے، پھونک دیا ہے۔ صاحب سن کر متامل ہوئے اور اٹھ کر جینٹ مجسٹریٹ کے پاس کہ دوسرے کمرے میں اجلاس کرتا تھا، چلے گئے اور کچھ غٹ پٹ کر کے خزانہ کے کمرے میں گئے اور صاحب خزانہ سے مصلحت کر کے گارد متعینہ خزانہ کو حکم کمر بندی دیا، اونھوں نے فی الفور حسب الحکم گولیاں بندوقوں میں بھر لیں اور تیار ہو گئے ...... تھوڑی دیر میں سنا کہ قلعہ دار و بڑے صاحب و ڈاکٹر صاحب و میم لوگ وغیرہ دروازے میں مارے گئے اور سوار قلعے میں چلے آئے۔ حضور اقدس بھی دستار مبارک زیب سر اور شمشیر ولایتی زیب کمر فرما کر تشریف فرمائے دربار ہوئے۔ شہر میں اوّل چند سوار کے آگے اور دریا گنج کے انگریزوں کو مارتے ہوئے اور دو بنگلا جلاتے ہوئے پیش اسپتال زیر قلعہ آئے اور چمن لعل ڈاکٹر کو بھی دارالشفائے اصلی نہیں پہنچا دیا۔

کہتے ہیں کہ بڑے صاحب و قلعہ دار و ڈاکٹر وغیرہ انگریز کلکتہ دروازے پر کھڑے ہوئے دوربین لگائے سڑک میرٹھ کا حال دریافت کر رہے تھے کہ دو سوار آئے۔ اس میں سے ایک نے تمنچہ اپنا جھاڑا اور ایک انگریز کو مار گرایا اور باقی جو بچ کر آئے حسب تحریر مذکورالصدر دروازہ قلعہ میں آ کر مارے گئے اور پھر اور سوار بھی آ پہنچے اور شہر میں غل ہو گیا

کہ فلاں انگریز وہاں مارا گیا اور فلاں انگریز وہاں پڑا ہے۔ راقم آثم بھی یہ چرچا دیکھ کر اور آواز بندوقوں کی سن کر بہ پاس دین وحمیت اسلام اپنے کلبہ احزان سے باہر نکلا تو بازار میں عجب عالم دیکھا کہ جانب بازار کشمیری دروازے سے لوگ بے تحاشہ بھاگے چلے آتے ہیں مگر چوں کہ حقیر کو تفریح طبع اور پاس خاطر اپنے ناظرین کا جانِ عزیز سے عزیز تر تھا لہٰذا بے تکلف واسطے دریافت حال کے سیدھا اسی طرف روانہ ہوا کہ زیر کوٹھی سکندر صاحب پہنچ کر ایک آواز بندوقوں کی باڑ کی سامنے سے سنائی دی۔ آگے چلا تو دیکھا کہ صاحب بہادر جیو پیدل شمشیر برہنہ درکف سراسیمہ وبدحواس بے تحاشہ بھاگے چلے آتے ہیں اور پیچھے پیچھے ان کے چند تلنگے بندوقیں سر کرتے چلے آتے ہیں اور عوامِ شہر بھی کسی کے ہاتھ میں لکڑی اور کسی کے ہاتھ میں پلنگ کی پٹی کسی کے ہاتھ میں بانس کا ٹوٹا اوس کے درپے چلے آتے ہیں۔''

اسی طرح 24رمئی کے شمارے میں شمالی ہندوستان کے کئی اور مقامات اور دہلی کے حالات غدر پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں کول، بلند شہر، کانپور، لکھنؤ، آگرہ، جھجر، سکندرہ، غازی آباد، بلب گڑھ، میرٹھ رُہتک اور کرنال شامل ہیں۔ اسی شمارے میں صفحہ اوّل پر مولوی محمد باقر کے فرزند مولوی محمد حسین آزاد کی نظم 'تاریخ انقلاب عبرت افزا' ملتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

کو ملک سلیمان و کجا حکم سکندر شاہان اولی العزم و سلاطین جہاں دار
کو سطوت حجاج و کجا صولت چنگیز کو خان ہلاکو و کجا نادرِ خوں خوار
نہ شوکت و حشمت ہے نہ وہ حکم نہ حاصل کس جا ہے جہاں اور کہاں ہیں وہ جہاں دار
کو رستم و سہراب و کجا سام و نریماں اس معرکے میں گُند ہے ایک ایک کی تلوار
کو حکمتِ لقمان و کجا علمِ فلاطوں خیل حکما و علمائے اولی الابصار
ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحب ابصار

Presented by: https://jafrilibrary.com/

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قومِ نصاریٰ ۔۔۔ تھی صاحبِ اقبال و جہاں بخش و جہاں دار
تھی صاحبِ علم و ہنر و حکمت و فطرت ۔۔۔ تھی صاحبِ جاہ و حشم و لشکرِ جرار
اللہ ہی اللہ ہے، جس وقت کہ نکلی ۔۔۔ آفاق میں تیغ غضب حضرتِ قہار
سب جوہرِ عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے ۔۔۔ سب ناخن تدبیر و خرد ہوگئے بیکار
کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت ۔۔۔ پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو یہیں مار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا ۔۔۔ ہے گردشِ گردوں بھی عجیب گردشِ دوّار
نیرنگ پہ غور اس کے جو کیجیے تو عیاں ہے ۔۔۔ ہر شعبدۂ تازہ میں صد بازیٔ عیّار
ہاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل ۔۔۔ ہیں بند یہاں اہلِ زباں کے لب گفتار
آنکھیں ہوں تو سب کھل گئی دنیا کی حقیقت ۔۔۔ مت کیجو دلا اس کا بھروسا کبھی زنہار
عبرت کے لیے خلق کی یہ سانحہ بس ہے ۔۔۔ گر دیوے خدا عقلِ سلیم و دلِ ہشیار
کیا کہیے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے ۔۔۔ حیراں ہے سب آئینہ صفت پشت بدیوار
حکامِ نصاریٰ کا بدیں دانش و بینش ۔۔۔ مٹ جائے نشاں خلق میں اس طرح سے یک بار

اس واقعے کی چاہی جو آزاد نے تاریخ

دل نے کہا : قل فاعتبروا یا اولی الابصار

۱۲۷۳ھ

(دہلی اردو اخبار، مورخہ 24 مئی 1857)

اس جنگ کی شخصی رپورٹنگ کرنے کے علاوہ مولوی محمد باقر، بہادر شاہ ظفر کے ایک معاون کی حیثیت سے بھی سرگرم رہے۔ شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ دہلوی نے اپنی تالیف 'تاریخ عروجِ سلطنت انگلشیہ ہند' میں لکھا ہے کہ

> ''بہادر شاہ ظفر کے حکم سے وہ مال گزاری کے اس شاہی خزانے کو کامیابی سے باحفاظت لے کر آئے جو پیدل فوج کی ایک پلٹن چند سواروں کے ساتھ گڑگاؤں سے دہلی لا رہی تھی اور جس پر راستے میں تین سو میواتیوں سے مڈبھیڑ ہونے کے بعد لڑائی ہو رہی تھی۔ اس کے لیے وہ بہادر شاہ کی

ہدایت پر امدادی فوجی سپاہ کو ساتھ لے کر گئے تھے۔''(8)

مولوی محمد باقر کے ایسے کارناموں سے خوش ہو کر بہادر شاہ ظفر نے اپنے نام کی مناسبت سے ان کے اخبار کا نام 'اخبار الظفر' کر دیا جس کا اعلان 12/ جولائی 1857 کے شمارے کے سرورق پر ہوا اور اس اخبار کے آخری دس شمارے اسی نام سے شائع ہوئے۔(9)

'دہلی اردو اخبار' نے اپنے صفحات پر نہایت ولولہ انگیز تقریریں شائع کیں۔ یہ تقریریں مجاہدین آزادی کے حوصلوں کو مہمیز کرنے والی تھیں۔ ایک ایسی ہی تقریر میں مجاہدین نے کہا تھا:

''یہ معرکہ تمہارا ابھی تواریخوں میں یادر ہے گا کہ کس بہادری اور جواں مردی سے تم نے ایسی اولوالعزم اور متکبر سلطنت کے کبر وغرور کو توڑا ہے اور ان کی نخوت فرعونی اور غرور شدادی کو یکسر خاک میں ملا دیا ہے اور ہندوستان کی سلطنت کو جس پر بڑے بڑے بادشاہوں کا دانت تھا اور ان سے (انگریزوں سے) نہ لے سکتے تھے۔ تم نے اون کے قبضۂ اقتدار سے نکال لیا اور رعایائے ہندوستان کو کہ بلائے ناگہانی میں آ گئی تھی اس مصیبت سے نجات دی۔''(10)

1857 میں 'دہلی اردو اخبار' کے غیر معمولی کردار کے بارے میں امداد صابری رقم طراز ہیں:

''دہلی میں جب تک جنگ جاری رہی اس وقت تک 'دہلی اردو اخبار' نے نہ صرف اپنے صفحات آزادی کو کامیاب کرنے کے لیے وقف کر رکھے تھے بلکہ اس کے بانی مولوی محمد باقر نے قلم کی جنگ کے علاوہ تلوار سے بھی انگریزوں سے جنگ لڑی اور جس وقت جنگ ناکام ہوئی اور انگریز دہلی پر قابض ہو گئے تو اخبار بند ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد باقر انگریزوں کی گولی کا نشانہ بنے اور جام شہادت نوش کیا۔''(11)

'دہلی اردو اخبار' کی نظر میں 1857 کے اسباب

سامراجی طاقتوں نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور رائے عامہ کو مجاہدین کا مخالف بنانے کی غرض سے دہلی میں ایک اشتہار چسپاں کیا، جس میں کمپنی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو مطعون کیا گیا تھا۔ 'دہلی اردو اخبار' (اشاعت 5 جولائی 1857) میں اس اشتہار میں جو باتیں کہی گئی تھیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ یہ بغاوت کمپنی کے نمک حرام سرکش نوکروں کی ہے۔ انھوں نے صرف عورتوں کو ہی قید نہیں کیا بلکہ بادشاہ کو بھی اپنا قیدی بنا لیا۔

2۔ وہ اس جدال وقتال کو جہاد کا نام دے رہے ہیں۔

3۔ انجیل کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ چربی لگے کارتوس کو دینا ہمیں منظور نہ ہوا۔ مسلمان سپاہیوں کے دین خراب کرنے میں ہمارا کیا فائدہ تھا۔

4۔ سور کھانا حرام ضرور ہے لیکن اس سے مسلمان دائرہ اسلام سے خارج تو نہیں ہو جاتا۔

5۔ اصل بغاوت ہندوؤں کی سازش ہے، لہٰذا ہمارے ساتھ متحد ہو کر ہندوؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔

اخبار نے انتشار اور غلط فہمی پیدا کرنے والے اس اشتہار کا طویل جواب شائع کیا اور ان حالات وواقعات کی نشاندہی کی جو انقلاب کا سبب بنے۔ اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

1۔ انگریزوں نے عیسائیت کو فروغ دیا اور اس کے لیے ترغیب وتحریص کے تمام اوچھے ہتھکنڈے اختیار کئے، جس کے نتیجے میں ہزارہا لوگ دین سے بے دین ہو گئے۔

2۔ رعایا کی جاگیریں حیلے بہانے سے ضبط کر لی گئیں، حالانکہ یہ وہ جاگیریں تھیں جن کے وہ دوامی مالک تھے۔

3۔ انگریزوں کی غاصبانہ اور جبر وتسلط کی پالیسی سے ہزارہا آدمی نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے۔

4۔ مذہبی شعائر پر پابندیاں لگائی گئیں۔ مذہبی رسومات ممنوع قرار دے دی گئیں۔ مثلاً ہندوؤں میں ستی کی رسم اور مسلمانوں میں عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کرنے پر جبری پابندی عائد کی گئی۔

5۔ بادشاہ کو ناقابل اعتماد سمجھا گیا اور کوئی موقع ان کی توہین کا ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا۔ بادشاہ سلامت کو اتنا مجبور و بے بس کر دیا گیا کہ انھیں دلّی سے باہر جانے تک کی اجازت نہ تھی۔ وہ ریزیڈنٹ کے بغیر براہ راست گورنر جنرل اور ملکہ سے خط و کتابت تک نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی راجا یا رئیس بادشاہ سے شرف ملاقات حاصل نہیں کر سکتا تھا۔(12)

'دہلی اردو اخبار' کے مدیر مولوی محمد باقر کی طرف سے دیے گئے اس منہ توڑ جواب سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اخبار مجاہدین کے حق میں خبروں کی اشاعت سے آگے بڑھ کر دانشورانہ سطح پر بھی انگریزوں کی سازشوں سے نبرد آزما تھا۔ اسی لئے اخبار نے انگریزوں کے پروپیگنڈے کا نکتہ وار مدلل جواب دے کر اس اشتہار کو پوری طرح بے اثر کر دیا اور ساتھ ہی اس کے پس پشت کارفرما مقصد کو بھی یہ کہتے ہوئے بے نقاب کیا کہ ''بے چارے ناواقف عوام کے بہکانے اور پھسلانے کے لیے (انگریز) جعل سازیاں کر رہے ہیں۔ مضامین اوس کے بے اصل، محض فریب اور صرف دھوکہ بازی کے ہیں۔''

قابل غور بات یہ ہے کہ انگریزوں کے مکروہ پروپیگنڈے مبنی مذکورہ اشتہار کا توڑ کرنے کے لیے اسے صرف اخبار تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے کتابچہ کی صورت میں شائع کر کے فی کتابچہ چار آنہ فروخت کیا گیا۔ کتابچے کے اشتہار میں اسے دہلی کے باہر ارسال کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی اور اس کی اشاعت کا مقصد بیان کرتے ہوئے بتایا گیا کہ: ''کوئی شخص کسی نصاریٰ کے دھوکے میں نہ آوے اور ان پر جہاد فرض جانے۔''(13)

مسٹر جے نٹراجن نے اپنی انگریزی کتاب 'ہسٹری آف انڈین جرنلزم' میں 'دہلی اردو اخبار' کے بارے میں دلچسپ معلومات اکٹھا کی ہیں۔ ان کے مطابق 1844

سے 1848 کے درمیانی عرصہ میں 'دہلی اردو اخبار' کی حالت بہتر ہو گئی اور اس کی اشاعت 69 سے 79 تک پہنچ گئی۔ لیکن آمدنی اور اخراجات میں پچاس فیصد کمی ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے خریداروں نے چندہ ادا نہ کیا۔ جب اخبار کی حالت دگرگوں ہونے لگی تو عملہ میں کمی کر کے اخراجات کم کیے گئے۔

نٹراجن نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولوی محمد باقر نے اکتوبر 1843 میں مظہر الحق کے نام سے ایک اور اخبار نکالا جس میں شیعہ فرقے کے خیالات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ مدیر کے طور پر شیخ امداد حسین کا نام دیا جاتا تھا اور اس اخبار میں 'دہلی اردو اخبار' کے کئی مضامین نقل کر لیے جاتے تھے۔ 'مظہر الحق' کی مالی حالت 1848 میں اتنی خراب ہو چکی تھی کہ بس بند ہونے کو تھا۔

حوالے

1۔ مقدمہ 'دہلی اردو اخبار' صفحہ:1

2۔ 'آب حیات'، صفحہ:26، مطبوعہ لاہور، 1950

3۔ مقدمہ 'دہلی اردو اخبار': خواجہ احمد فاروقی

4۔ مقدمہ 'دہلی اردو اخبار'

5۔ 'اٹھارہ سوستاون، اخبار اور دستاویزیں' صفحہ:16

6۔ 'دہلی اردو اخبار'، 12 اپریل 1857

7۔ 'اٹھارہ سوستاون، اخبار اور دستاویزیں'، صفحہ:17

8۔ امداد صابری: 'تاریخ صحافت اردو' (جلد اول) دہلی 1953، صفحہ:212

9۔ عتیق صدیقی: 'ہندوستانی اخبار نویسی': صفحہ:395

10۔ 'دہلی اردو اخبار': 21 رجون 1857، نمبر:24 جلد:19

11۔ امداد صابری: 'روح صحافت' مطبوعہ 1968، صفحہ:61-260

12۔ 'دہلی اردو اخبار' 5 جولائی 1857، بحوالہ 'اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں' صفحہ:139 تا 140

13۔ 'اخبار الظفر' 12 جولائی 1857، بحوالہ 'اٹھارہ سوستاون اخبار اور دستاویزیں، صفحہ:169 تا 172

مولوی محمد باقر کی شہادت

عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے اس لئے قتل کیا کہ انہوں نے 1857 کی تحریک میں اپنے اخبار کے ذریعہ، لوگوں کے دلوں کو گرمانے اور آزادی کی جوت جگانے کا 'جرم' کیا تھا۔ تحریک شروع ہونے کے بعد دہلی اردو اخبار کی رپورٹنگ کو دیکھ کر بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز ان کی بے باکی اور جرأت سے خاصے پریشان تھے لیکن مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کی شہادت کا تعلق صحافت سے نہیں بلکہ دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کی موت سے تھا جسے انہوں نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ اس سلسلہ میں مولوی عبدالحق کا بیان ملاحظہ ہو۔

"1857 کے ہنگامہ و آشوب میں بہ ہزار دقت ٹیلر صاحب کالج کے احاطے میں آئے اور اپنے بڈھے خانساماں کی کوٹھری میں گھس گئے۔ اس نے انہیں مولوی محمد حسین آزاد کے والد کے گھر پہنچا دیا۔ مولوی محمد باقر سے ان کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی، انہوں نے ایک رات تو ٹیلر صاحب کو اپنے امام باڑے کے تہہ خانے میں رکھا لیکن دوسرے دن جب ان کے امام باڑے میں چھپنے کی خبر محلے میں عام ہوگئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر صاحب کو ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا۔ مگر ان کا بڑا افسوس ناک حشر ہوا۔ غریب بیرام خاں کی کھڑکی کے قریب جب اس سج دھج سے پہنچے تو لوگوں نے پہنچان لیا اور اتنے لٹھ برسائے کہ بے چارے نے وہیں دم دے دیا۔ بعد میں مولوی محمد باقر صاحب اس

جرم کی پاداش میں سولی پر چڑھا دیئے گئے اوران کا کوئی عذر نہ چلا۔ مولوی محمد حسین آزاد کا بھی وارنٹ کٹ گیا۔ مسٹر ٹیلر کے مارے جانے میں ان کی بھی سازش خیال کی گئی اوران پر بھی قوی شبہ تھا۔ مگر یہ راتوں رات نکل بھاگے اور کئی سال تک سرزمین ایران میں بادیہ پیمائی کرتے رہے۔ جب معافی ہوئی تو ہندوستان واپس آئے۔"(1)

اس سلسلہ میں مولوی ذکاء اللہ اور آغا محمد باقر وغیر کے بیانات اس سے قدرے مختلف ضرور ہیں لیکن اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ مولوی محمد باقر کو پرنسپل ٹیلر کے قتل کے الزام میں سزائے موت دی گئی۔ سرعبدالقادر مرحوم نے محمد حسین آزاد کے حوالے سے لکھا ہے کہ ٹیلر نے مولوی محمد باقر کے گھر سے نکلتے وقت کاغذات کا ایک بنڈل ان کے حوالے کرتے ہوئے ہدایت کی کہ انگریزوں کا اگر دہلی پر قبضہ ہوجائے تو پہلا انگریز جوتم کونظر آئے یہ بنڈل اس کے حوالے کردینا اور انہوں نے یہی کیا۔ دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ تسلط کے بعد یہ بنڈل انہوں نے ایک انگریز کرنل کی خدمت میں پیش کردیا۔ ان کو، بہ قول سرعبدالقادر، اس کا گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہی بنڈل ان کی موت کا حکم نامہ بن جائے گا۔ ٹیلر نے اس بنڈل کی پشت پر لاطینی میں لکھا تھا کہ:

"مولوی محمد باقر نے پہلے تو مجھے اپنے گھر میں پناہ دی، لیکن انہوں نے ہمت ہاردی، اورمیری جان بچانے کی کوشش نہیں کی۔" اسی تحریر کی بناء پرانہیں گولی مار دی گئی اوران کی ساری املاک ضبط ہوگئیں۔(2)

واضح ہو کہ تقریباً یہی بات ڈاکٹر آغا محمد باقر نے جزوی اختلاف کے ساتھ نقوش (لاہور) کے شخصیات نمبر میں محمد حسین آزاد، پراپنے مضمون میں لکھی ہے۔ لیکن ڈاکٹر عبدالحق اور مذکورہ بیان میں ایک تضاد یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق نے مولوی محمد باقر کوسولی پر چڑھانے کا ذکر کیا جبکہ مذکورہ اقتباس میں انہیں گولی مارنے کی بات کہی گئی ہے۔ بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہیں توپ کے دہانے پر رکھ کر اڑا دیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں گربچن چندن 1857 کے دلاوروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"شمالی ہند کی نوزائیدہ اردو صحافت جو اپنے فارسی پیش رو قلمی وقائع نگاروں کی بدولت وقت سے پہلے بالغ اور قابل قربانی ہوگئی تھی، اس کے اولین مدیر مولوی محمد باقر بھی تھے جنہوں نے 77 سال کی کبرسنی میں خندہ پیشانی سے اپنے نازک سینے پر فرنگی کی توپ کا گولہ جھیلا اور اس کے ساتھ ہی وجد کی حالت میں عالم ملکوت کے عارف ہوگئے۔"(3)

مولوی محمد باقر کی شہادت کب اور کیسے ہوئی، اس سلسلے میں جو تفصیلات ان کے خاندانی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں ایک اہم بیان آغا محمد باقر (نبیرہ محمد حسین آزاد) کا ہے جو اس سلسلے میں سب سے زیادہ مستند اور قابل یقین معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب دلی میں غدر پڑا، مولانا (محمد حسین آزاد) کی عمر کوئی تیس برس تھی۔ دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر ان کے والد کے گہرے دوست تھے۔ وہ کالج کے کچھ کاغذات لے کر مولانا کے گھر آگئے اور چار دن چھپے رہے۔ آخر باغیوں کو پتہ چل گیا کہ مسٹر ٹیلر مولانا کے یہاں روپوش ہیں۔ دروازے کے سامنے بہت سے شورہ پشت جمع ہوگئے اور شور مچایا کہ ٹیلر کو ہمارے حوالے کردو۔ سمجھانے بجھانے سے یہ لوگ تو چلے گئے مگر ٹیلر اپنے کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ دوسرے دن علی الصباح وہ اپنے ضروری کاغذات مولانا باقر کے حوالے کر کے گھر سے نکلے کہ کشمیری دروازے سے باہر نکل جائیں اور انگریزی فوج سے جاملیں لیکن باغی ان کی تاک میں تھے۔ انہوں نے نکلتے ہی بھانپ لیا۔ وہ بھاگ کر مولانا باقر کی مسجد میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں سے بھی گھسیٹ نکالا اور پاؤں میں رسی باندھ کر گلیوں میں گھسیٹتے پھرے، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہوگیا۔

جب دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو مولانا محمد باقر مسٹر ٹیلر کی ہدایت کے بموجب ان کے کاغذات لے کر انگریز حاکم کے پاس پہنچے۔ وہ کاغذات دیکھتے ہی آگ بگولہ ہوگیا اور پوچھا۔ مسٹر ٹیلر کہاں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ انہیں لوگوں نے مار دیا۔ اس نے حکم دیا۔ انہیں گرفتار کرلو اور گھر لوٹ کر

ضبط کرلو۔ادھر مولانا گرفتار ہوئے۔ادھر کامیاب سپاہی گھر میں گھس آئے۔
گھر میں بائیس نیم جان تھے۔ سنگینیں دکھا کر انہیں گھر سے نکال دیا اور تمام
املاک بحق سرکار ضبط ہو گئی۔دو چار روز میں معلوم ہوا کہ انہیں گولی ماردی
گئی۔" (4)

مولوی محمد باقر کی شہادت سے متعلق آغا محمد باقر کا یہ بیان سب سے زیادہ معتبر دستاویز ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولوی محمد باقر کی گرفتاری کے دو چار روز بعد انہیں گولی ماری گئی۔ان کے گھر کی قرقی اور ضبطی ہوئی اور بعد کو مولانا محمد حسین آزاد بھی خاصی آزمائشوں سے گذرے لیکن یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ باغیوں کے ہاتھوں پرنسپل ٹیلر کی ہلاکت کے بعد مولانا محمد باقر ان کا سامان لے کر انگریز حاکم کے پاس گئے کیوں؟۔وہ اس بات کو کیوں نہیں محسوس کر سکے کہ حالات بہت نازک ہیں اور پرنسپل ٹیلر کے قتل کی اطلاع ان کی زبانی سن کر انگریز حاکم مشتعل ہوسکتا ہے۔مولوی محمد باقر اس بات سے بھی قطعی لاعلم تھے کہ پرنسپل ٹیلر نے لاطینی زبان میں مولوی محمد باقر کے ذریعہ پہلے پناہ دینے اور بعد کو اپنے ہاتھ اٹھا لینے کی بات لکھی تھی۔

شہادت کا منظر

مولوی محمد باقر کے نواسے آغا محمد باقر نے خاندانی روایت کے حوالے سے اپنے نانا کے آخری ایام کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے۔

"خاندانی روایت یہ ہے کہ مولانا آزاد (محمد حسین آزاد) سردار سکندر سنگھ
کے پاس کشمیری دروازے چلے آئے اور سردار بہادر سے بصد منت سماجت
التجا کی کہ میں اپنے شفیق باپ کی آخری بار زیارت کرنا چاہتا ہوں۔سردار
بہادر نے جواب دیا۔ حالات بہت خطرناک ہیں آپ کا دہلی میں ٹھہرنا
خطرے سے خالی نہیں لیکن آزاد نہ مانے آخر سردار صاحب راضی ہو گئے۔
قرار پایا کہ آزاد ان کے ساتھ سائیں کا لباس پہن کر چلیں۔وہ گھوڑے پر

سوار ہو گئے اور آزاد سائیں کے لباس میں ان کے پیچھے بھاگے۔ دہلی دروازے کے پاس میدان میں ایک ہجوم نظر آیا۔ جو دن کی دھوپ سے نڈھال تھا۔ فوجی پہرے میں وہ اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے تھے۔ اس ہجوم میں ایک طرف ایک مرد خدا نہایت خشوع وخضوع سے اپنے پروردگار کی عبادت میں محو تھا۔ وہ آزاد کے شفیق باپ مولوی محمد باقر تھے۔ آزاد گھوڑے کی باگ تھامے فاصلے پر کھڑے منتظر تھے کب آنکھیں چار ہوں۔ مولوی صاحب نے نماز ختم کر کے نظر اٹھائی تو سامنے اپنے پیارے بیٹے کو پایا۔ چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوئے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ادھر یہی حالت بیٹے پر گذری۔ انہوں نے دعا کے لئے فوراً ہاتھ اٹھائے اور ساتھ ہی اشارہ کیا کہ بس آخری ملاقات ہو چکی۔ اب رخصت۔ سردار صاحب نے اپنا گھوڑا موڑ لیا اور واپس چلے آئے۔"(5)

آغا محمد باقر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی محمد باقر کو جنرل ہڈسن نے اس وقت گولی نہیں ماری تھی جب وہ پرنسپل ٹیلر کا سامان لے کر گئے تھے بلکہ مولوی محمد باقر کی شہادت کا واقعہ انہیں حراست میں لینے کے بعد کا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ مولوی محمد باقر کو گرفتار کرنے کے بعد ان کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلا اور نہ ہی انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا بلکہ انتہائی ظالمانہ طریقے سے انہیں 77 سال کی پیرانہ سالی میں نہایت سفاکی سے شہید کر دیا گیا۔

ٹیلر کا قتل

ٹیلر کے قتل کے سلسلے میں دہلی اردو اخبار نے اپنے 17 مئی 1857 کے شمارے میں لکھا کہ ٹیلر دوسرے انگریزوں کے ساتھ میگزین میں محصور تھے۔ جب میگزین اڑا دیا گیا تو چند آدمی مارے گئے اور باقی نکل گئے۔ نکلنے والوں میں ٹیلر بھی شامل تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''سنا گیا ہے کہ ٹیلر صاحب پرنسپل مدرسہ بھی یہیں بند تھے اوس دن تک کچھ آب و دانہ باقی تھا اور کوئی دن دنیا کی ہوا کھانی تھی کہ دوسرے دن یوم سہ شنبہ قریب دو پہر اسی تھانے کے علاقہ میں مارے گئے۔ یہ شخص مذہب عیسوی میں نہایت متعصب تھا اور اکثر ناواقف لوگوں کو اغوا کیا کرتا تھا۔ چناں چہ ڈاکٹر چمن لال کا خون اوسی کی گردن پر رہا۔ عجیب شانِ ایزدی ہے کہ یہ شخص نہایت مالدار تھا۔ قریب ۲ لاکھ روپیہ اس کا بنک کلکتہ و دہلی میں جمع تھا اور چند بنگلہ وغیرہ کرایۂ کثیر کے چھاؤنی میں تھے اور یہ روپیہ بھی اس قدر سعی و کوشش سے جمع کیا تھا کہ صرف ڈیڑھ آنہ یا چار پیسے روز اپنی ذات کے صرف طعام میں لاتے تھے اور باقی سب داخل بنک۔ دن رات میں جو وقت فرصت ہوتا تھا اوسے حساب کتاب زر بنک میں صرف کرتے تھے۔ کپڑے بھی صرف ضرورتاً قابل جلسہ اہل جلسہ کے پہنتے تھے۔ لیکن قابل عبرت ہے حال دنیائے دون کا کہ باوجود اس زر کثیر کے دن بھر لاشہ برہنہ خاک وخون میں غلطاں پڑا رہا۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ فقیری لباس اس وقت تھا اور مونہ پر خاک ملی ہوئی تھی۔'' (6)

مولوی محمد باقر کے نہایت ہونہار بیٹے مولانا محمد حسین آزاد کا اردو ادب میں ایک خاص مقام ہے۔ وہ اس دور میں دہلی اردو اخبار کے طابع و ناشر تھے اور ادارتی امور میں بھی اپنے والد کی نیابت کرتے تھے۔ والد کے بہیمانہ قتل کے بعد محمد حسین آزاد کی گرفتاری کا وارنٹ بھی جاری ہوا چنانچہ وہ دہلی میں روپوش ہوئے۔ پھر لکھنؤ گئے۔ وہاں سے روانہ ہونا پڑا اور ایک طویل مدت کے بعد چین نصیب ہوا۔

16 ستمبر 1857 کو حاکمان وقت نے مولوی محمد باقر کو انگریزی حکومت کا باغی اور سزائے موت کا مستحق قرار دے کر ان کی تمام املاک ضبط کر لی اور اس کے بعد ان کے کنبے پر جو گزری اس کا مختصر حال محمد حسین آزاد نے دیوان ذوق میں قلم بند کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتہً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی، بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں

حیران تھا کہ کیا کیا اٹھا کر لے چلوں۔ان (استاد ذوقؔ) کی غزلوں کے جنگ
پر نظر پڑی یہ بھی خیال آیا کہ محمد حسین، زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا مگر
استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔اب ان کے نام کی
زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ رہیں گے۔ یہ
گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی 'جنگ' اٹھا بغل میں مارا، سجے سجائے گھر کو
چھوڑ، بائیس نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔"

آزاد کے ساتھ گھر چھوڑنے والوں میں محمد حسین آزاد کی اہلیہ، دونوں بیٹیاں،
بہن، پھوپھی اور ان کی بیٹی، مولوی محمد باقر کی حرم، ان کے سالے اور سالوں کی
بیویاں، بچے، بڑی پھوپھی کے بیٹے، مامائیں، ماما کا بیٹا، منشی بشیر حسین، ان کی بیوی اور
چھ بچے شامل تھے۔

یہ خانماں برباد قافلہ دھوبی واڑے کی گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک گولہ زمین پر آ کر
گرا۔مولانا محمد حسین آزاد کی گود میں ان کی چھوٹی بیٹی تھی جس کی عمر ڈیڑھ سال کی تھی۔ یہ
معصوم بچی دھماکے سے پہلے تو بے ہوش ہوگئی اور پھر کئی دن اسی عالم میں رہ کر اللہ کو پیاری
ہوگئی۔'دہلی اردو اخبار' کے ایک ملازم اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اس قافلے میں شامل تھے۔
یہ سونی پت کے رہنے والے تھے۔ آزاد نے اپنے لواحقین کو ان کے ساتھ سونی پت کی
طرف روانہ کیا اور خود کسی طرح والد کو آخری بار دیکھنے کی غرض سے دہلی میں ٹھہر گئے۔آزاد
دہلی سے روانہ ہوئے تو ساتھ میں صرف استاد ذوقؔ کے کلام کا مسودہ تھا۔ جمنا پل کے
قریب ایک انگریز سپاہی نے تلاشی کے لیے اس پلندے پر سنگین ماری تو کاغذات زمین پر
بکھر گئے بمشکل تمام آزاد نے یہ کاغذات سمیٹے اور لشتم پشتم شہر سے نکل گئے۔(7)

مولوی محمد باقر کا خاندان

یوں تو مولوی محمد باقر کے خاندانی حالات کئی کتابوں اور مضامین میں بیان کیے گئے
ہیں☆ حال ہی میں ان کے خاندان کی ایک خاتون بلقیس موسوی کا ایک مضمون ماہنامہ آج

کل (دسمبر 2007) میں شائع ہوا ہے۔ انہوں نے خودکو مولوی محمد باقر کے پوتے کی نواسی بتلایا ہے اور اپنے بچپن کی دھندلی یادوں سے پردہ اٹھایا ہے جس سے مولوی محمد باقر کے خاندان کے کچھ نئے گوشے وا ہوتے ہیں۔

بلقیس موسوی نے اپنے مضمون میں مولوی محمد باقر سے متعلق بزرگوں کی زبانی سنی ہوئی بعض باتیں بیان کی ہیں جنہیں یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

"غدر کے ان ہنگاموں میں آزاد اپنے استاد یعنی ذوق کا دیوان ہی لے کر نکلے تھے۔ اس وقت مولوی محمد باقر انگریزوں کی قید میں پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ اپنے سے متعلق کسی بھی شئے کا خودان کے پاس ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اگر کوئی قلمی تصویر رہی بھی ہوگی تو وہ بھی گھر کے سامان کے ساتھ مٹ چکی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والی نسلوں پر محمد باقر کے بجائے آزاد کی چھاپ زیادہ نظر آتی ہے۔"

بلقیس موسوی کے مطابق:

"آزاد کے ہوش وعالم وارفتگی میں تحریر شدہ کاغذات اور دیگر اہم کاغذات ان کے دلی کے گھر میں تھے۔ وہیں ماموں باقر ☆ رہتے تھے۔ گمان ہے کہ والد کے گھر کو آزاد نے معمولی ردوبدل کر کے ذاتی امام باڑے میں تبدیل کر لیا تھا۔ چونکہ یہ مکان رہنے کے کام میں بھی آتا تھا۔ اسی لئے شاید انہوں نے اس کا نام آزاد منزل رکھا۔ تیرہ چودہ سال پہلے میں اور ماموں طاہر کے بیٹے (حسین آزاد مقیم لندن) اس کی زیارت کی تمنا لے کر گلی پنجہ شریف (امام باڑہ) محلہ گندا نالا (موری گیٹ) واقع کشمیری گیٹ گئے۔ ہم لوگ وہ دیواریں دیکھنا چاہتے تھے جن پر مولوی محمد باقر کی موت کا حکم نامہ درج کیا گیا تھا۔ علاقہ تو وہی قدیم نظر آرہا تھا۔ ویسے ہی دو تین صدر دروازے بھی نظر آئے کہ یہی رواج تھا فن تعمیر کا۔ آزادی سے پہلے یہ سو

☆ یہ وہی آغا محمد باقر ہیں، محمد حسین آزاد پر 'نقوش' لاہور کے حوالہ سے جن کے مضمون کا ذکر ہم نے گزشتہ صفحات میں کیا ہے۔

فیصدی مسلم علاقہ تھا۔ اب ملی جلی آبادی نظر آئی۔ پنجہ شریف اور ملحق قبرستان تک گئے۔ وہاں آزاد کے دو پوتے (اسماعیل اور یوسف) دفن ہیں۔"

بلقیس موسوی نے اپنے مضمون میں مزید لکھا ہے کہ:

"آزاد کی کتابیں، قلمی نسخے اور یہاں تک کہ عالم وارفتگی کی کچھ جوڑ بے جوڑ تحریریں، نیز ان کا عمامہ، کلاہ اور دیگر اہم ساز و سامان کے دو تین صندوق ماموں باقر کے ہی پاس تھے۔ آغا محمد باقر 1947 میں آل انڈیا ریڈیو سے ٹرانسفر لے کر ریڈیو پاکستان چلے گئے تھے۔ اور وہ انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ (بلقیس موسوی کا خیال ہے کہ ان کاغذات میں اپنے والد مولوی محمد باقر کے بارے میں لکھی ہوئی محمد حسین آزاد کی بعض تحریریں بھی ہوں گی) آغا محمد باقر کی اہلیہ اور بیٹے سلمان باقر کے پاس لاہور میں یہ سارا سامان اور سب نوادرات موجود ہیں۔"

بلقیس موسوی نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

"ذوقؔ، مولوی محمد باقر کے بہت عزیز دوست تھے۔ ان کے ساتھ اکثر بیٹھکیں ہوتیں، محفلیں جمتیں، کبھی کبھار انہیں کے ساتھ مولوی محمد باقر قلعہ معلیٰ بھی جاتے تھے۔ کبھی سواری کا ذکر نہیں آیا۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ دونوں آس پاس ہی رہتے تھے یا یہ کہ اس زمانے میں پیدل چلنے کا رواج رہا ہوگا۔ والد کے ہمراہ آزاد بھی ان محفلوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ دیوانِ ذوقؔ کے کسی ایڈیشن میں آزاد نے ان ملاقاتوں اور محفلوں کا مفصل ذکر بھی کیا ہے۔"

اپنے اسی مضمون میں بلقیس موسوی نے لکھا ہے کہ:

"انہوں نے 1954 میں اپنے ماموں آغا محمد باقر کے پاس خاندانی ذخیرے دیکھے تھے ان میں دہلی اردو اخبار کے بھی کئی پرچے شامل تھے۔"(8)

مولانا محمد باقر کے آبا و اجداد ہمدان (ایران) کے باشندے تھے۔ سلسلہ نسب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ اس خاندان کا ہر فرد اپنی قابلیت کی بناء پر

اخونداور خلیفہ کہلاتا تھااور علماء میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ مولانا باقر کے جد اعلیٰ اخوند محمد ابراہیم الہمدانی تھے۔ ان کے صاحبزادے اخوند محمد یوسف ہوئے اور اخوند محمد یوسف کے بیٹے اخوند محمد عاشور ایران سے ترک وطن کر کے کشمیر میں سکونت پذیر ہوئے۔ اس وقت ہندوستان میں محمد شاہ بادشاہ کی حکومت تھی۔ اخوند محمد عاشور کے فرزند اخوند محمد اشرف کی پیدائش کشمیر میں ہوئی۔ بعد کو وہ معاشی ضرورتوں کے تحت دہلی آ گئے اور مولوی محمد باقر کے والد اخوند محمد اکبر کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ اخوند محمد اکبر صاحبِ تصنیف تھے جنھوں نے دہلی میں عرصہ تک تبلیغ و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کو علمی اور دینی کتب جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اور اسلامی کتابوں کا قیمتی ذخیرہ ان کی لائبریری کا حصہ تھا۔(9)

خاندانی دستور کے مطابق اخوند محمد اشرف اور اخوند محمد اکبر نے اپنی شادیاں ایران میں جا کر کیں۔ مغلیہ حکومت میں ان کی علمیت کا سکہ تسلیم کر لیا گیا تھا جس کی وجہ سے ان کو وظیفہ ملا کرتا تھا۔ محترمہ بلقیس موسوی نے ماہنامہ 'آجکل' (دسمبر 2007) میں لکھا ہے کہ:

"مولوی محمد باقر نے اپنے بیٹے محمد حسین آزاد کی شادی خاندان کے دستور کے مطابق ایران ہی میں کی تھی۔ سننے میں تو یہی آتا ہے کہ ہر پشت میں صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہی ہوتے تھے۔ مولوی محمد باقر نے بیٹے سے کہا:

"عزیز من اولاد کے معاملے میں غالباً تم بھی بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے والے ہو۔ یعنی دو ہی بچے تمہارے نصیب میں ہوں گے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ تم اپنے بیٹے کے لیے کسی ایسے معزز گھرانے کی لڑکی کا انتخاب کرنا جس جگہ اولاد کی چہل پہل سے گھر بارونق ہو۔"

محترمہ بلقیس موسوی مزید لکھتی ہیں کہ:

"آزاد نے فراشخانہ (دہلی) کے ایسے ہی خاندان کی بہو چنی۔ آزاد کے بھی حسب روایت دو ہی بچے پیدا ہوئے۔ بیٹے کا نام ذوق کے نام پر ابراہیم رکھا۔ یہی میرے نانا تھے۔ مولوی محمد باقر کے خاندان میں شامل ہونے والی پہلی غیر ایرانی خاتون میری نانی تھیں۔ وہ ایرانی نہیں تھیں تو کیا ہوا، تھیں وہ بھی بلا کی حسین۔

میرے نانا اور نانی کے ہاں گیارہ بچے پیدا ہوئے۔ ان میں چھٹے نمبر پر میرے ماموں طاہر اور آٹھویں پر میری اماں تھیں۔ مولوی محمد باقر کی یہ بھی وصیت تھی کہ ''اگر تمہارے ایک سے زیادہ بیٹے ہوں تو ایک کا نام اشرف رکھنا (مولوی محمد اشرف ان کے بزرگوں میں تھے) ورنہ یہ پیغام اپنے بیٹے تک پہنچا دینا۔''
آزاد اپنے والد کی ان خواہشات کو خود تو انجام نہ دے سکے لیکن میرے نانا نے حق ادا کر دیا۔ 1907 میں جب نویں نمبر پر ماموں باقر پیدا ہوئے تو آزاد مدتوں پہلے اپنے ہوش وحواس کھو چکے تھے۔ اس لیے وہ بتا تو نہ سکے، البتہ ان کی بہن کے خاندان میں ایک بزرگ ایسے حیات تھے جنھوں نے مولوی باقر کو دیکھا تھا۔ انھوں نے اعلان کیا: ''مبارک ہو یہ تو مولوی باقر کا ہم شکل بیٹا تمہیں خدا نے عطا کیا ہے۔'' (10)

تعلیم وتربیت

مولوی محمد باقر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اخوند محمد اکبر سے حاصل کی۔ بعدہٗ دہلی کے نامور عالم دین عبدالرزاق کے سامنے زانوئے ادب طے کیا، جو انھیں کابلی دروازے میں درس دیتے تھے۔ 1825 میں مولوی محمد باقر نے دہلی کالج کا رخ کیا اور یہاں تعلیم مکمل ہونے کے بعد درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے کہ یہی ان کا شغف بھی تھا۔ طلباء کو ان کے درس سے اتنی گہری دلچسپی تھی کہ وہ اپنی کلاسیں چھوڑ کر مولوی محمد باقر کے درس میں شامل ہوتے تھے۔ بطور معلم ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے گورنر جنرل نے انھیں خلعت عطا کی اور جب رئیس المدرسین مولوی رشید الدین طویل رخصت پر گئے تو کالج کے پرنسپل نے مولوی محمد باقر کو ہی ان کا قائم مقام مقرر کیا۔ یہ بات مشہور تھی کہ جو طالب علم 'ہدایہ' اور 'اقلیدس' جیسے مضامین ایک بار مولانا باقر سے پڑھ لیتا تھا تو اسے کسی اور مدرس کے درس میں لطف نہ آتا تھا۔ مولانا محمد باقر دہلی کالج میں 1828 سے 1834 تک مسلسل سات برس ملازم رہے۔ بعد ازاں کلکٹر دہلی مسٹر مٹکاف کی کوششوں

سے ان کو محکمہ کلکٹری میں ملازمت ملی۔ آپ نے مدت تک تحصیلداری کی اور پھر محکمہ بندوبست میں سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔(11)

یہ ملازمت آپ نے سولہ سال تک کی اور تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا کیونکہ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ سے ان کی گزر اوقات نہیں ہوتی تھی۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ان کا بیشتر وقت تصنیف و تالیف، پند و نصیحت، وعظ و تبلیغ علوم دین میں صرف ہوتا تھا۔

افسوسناک تنازعہ

1834 میں مولوی محمد باقر نے دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر اسپرنگر سے ایک لیتھو پریس خریدا اور اس کا نام مطبع جعفریہ اور مطبع اثنا عشری رکھا۔ بعد میں اس کا نام اخبار کی مناسبت سے اردو اخبار پریس ہو گیا، جس میں 1836 سے 'دہلی اردو اخبار' کی اشاعت شروع ہوئی۔ ابتداء میں مولوی محمد باقر ایک ذاتی اور مسلکی تنازعہ کا شکار ہوئے جو قاری جعفر علی کی طرف سے پیش آیا۔ اس موقع پر دہلی میں دو پارٹیاں باقریہ اور جعفریہ بن گئیں اور آپس میں مکالمے اور مجادلے شروع ہو گئے۔ قاری جعفر علی کو مولانا محمد باقر نے ہی تعلیم دلوائی اور ملازم بھی کروایا لیکن وہ ذرا سی بات پر ان سے بدظن ہو کر مولانا کے جانی دشمن ہو گئے اور بات مقدمے بازی تک جا پہنچی۔ قاری جعفر علی نے 1848 میں مولانا باقر کے خلاف مقدمہ دائر کیا جس میں الزام عائد کیا کہ:

> "مولانا باقر میرے خلاف اپنے اخبار میں لکھتے ہیں اور مولانا کے آدمی راستے میں مجھ پر آوازہ کشی کرتے ہیں، برا بھلا کہتے ہیں، مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے۔"

مقدمہ چلا۔ دونوں طرف سے شہادتیں ہوئیں جن کی روشنی میں عدالت نے قاری جعفر علی کے الزامات کو ناقابل اعتبار سمجھ کر مقدمہ خارج کر دیا۔ مگر قاری جعفر علی نے مولوی محمد باقر کی مخالفت بند نہیں کی اور ان کے خلاف نہایت افسوسناک پمفلٹ شائع کیے، جس میں مولوی محمد باقر کے ذریعہ ایک امام بارہ کی تعمیر پر خرچ کی گئی رقم کے

جائز ہونے پر بھی انگلی اٹھائی گئی، بعض علماء سے فتوے بھی لیے گئے۔ یہ افسوسناک تنازعہ 1848 سے شروع ہوکر 1854 تک جاری رہا۔ اس قضیے میں مولانا باقر اور دوسرے گواہوں نے جو بیانات عدالت میں دیے، ان سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا باقر محتاط و معتدل طبیعت کے انسان تھے۔ اختلافی معاملات میں دل شکن رویہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ مولانا باقر شیعہ تھے لیکن سنی علماء بھی ان کی عزت کرتے تھے اور ان کو بھی ان پر اعتماد تھا۔ چنانچہ جب مقدمہ چلا تو مولانا باقر نے اپنے بیان میں کہا تھا:

"رؤسا شہر مثل مفتی صدرالدین، مفتی عطاء اللہ خاں اور حکیم احسن اللہ خاں سے میرا نیک چلن اور مدعی کی زیادتی بذریعہ خط دریافت فرمالیں۔"(12)

مولوی محمد باقر اور جعفر علی کے اس طویل تنازعہ کی تصدیق جے نٹراجن کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے سرکاری کاغذات کے حوالے سے 'دہلی اردو اخبار' کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اس اخبار میں عام باتوں کے علاوہ دہلی کالج کے شیعہ استاد عربی جعفر علی کے خلاف کئی مراسلات شائع کیے گئے جن میں اس پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ ٹھیک طور پر اپنے تعلیمی فرائض انجام نہیں دیتا اور جس عہدے پر مقرر ہے اس کے لیے اس کی نااہلیت مسلم امر ہے۔(13)

بہادر شاہ ظفر سے قربت

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے کہ مولوی محمد باقر کے استاد ذوق سے گہرے مراسم تھے اور ذوق چونکہ بہادر شاہ ظفر کے نہایت محبوب استاد تھے۔ استاد ذوق کے ساتھ مولانا باقر کی لال قلعہ میں آمد و رفت تھی اور مولانا باقر بھی بہادر شاہ ظفر سے اسی طرح محبت کرتے تھے، جس طرح استاد ذوق کرتے تھے۔

11 مئی 1857 کو جب دہلی میں شورش کا آغاز ہوا تو اس میں مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار کو ہی نہیں بلکہ خود کو بھی اس لڑائی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انگریزوں کے

مخبر جیون لال نے اپنے 11 مئی 1857 کے روزنامچے میں مولانا باقر کی بہادر شاہ ظفر سے قربت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"آج کے دن بادشاہ نے مولوی محمد باقر اور مولوی عبدالقادر کو باریاب ہونے کی عزت بخشی کیونکہ انھوں نے اپنے فرائض منصبی کو نہایت ذہانت اور بہادری سے سرانجام دیا تھا۔ موخرالذکر نے اطلاع دی کہ میں ایسے انتظام کر آیا ہوں جس کی وجہ سے باغی خود بخود شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ بادشاہ نے مولوی باقر کو خلعت عنایت کیا اور مولوی عبدالقادر کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ شاہی ہودہ میں بٹھا کر ان کے گھر روانہ کیا۔(14)

مولوی محمد باقر پر بہادر شاہ ظفر کو خاصا اعتماد تھا۔ ایک پلٹن گوڑ گاؤں سے خزانہ لاتے ہوئے میواتیوں کے حملے کا شکار ہوئی تو اس کی مدد اور خزانہ کی بحفاظت واپسی کی ذمہ داری بہادر شاہ ظفر نے مولوی محمد باقر کو سونپی۔ اس واقعہ کو رسالہ 'بغاوت ہند آگرہ' (جولائی 1859) نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

"اتنے میں ایک سوار آیا اور خبر کی کہ چند لاکھ روپے بابت مالگذاری گوڑ گاؤں بحراست ایک کمپنی پیادگان اور چند سوار دہلی کو آنا تھا۔ راستہ میں تین سو میواتیوں نے حملہ کیا اور لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ سن کر مولوی محمد باقر چھاپہ خانہ والے کو یہ حکم ہوا کہ فوراً دو کمپنیاں سپاہی اور ایک توپ سواران لے کر جاوے اور خزانے کو محفوظ لے آوے۔"

مولانا امداد صابری نے مولوی محمد باقر کو انگریزوں کے دانت کھٹے کر دینے والے اخبار نویس قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"11 مئی 1857 کو دہلی میں مجاہدین نے انگریزی حکومت کا خاتمہ کرنے والا جو تاریخی کارنامہ انجام دیا اس کی جو رپورٹ 16 مئی 1857 کے دہلی اردو اخبار میں شائع ہوئی تھی، وہ مولانا محمد باقر کی مرتب کردہ تھی اور باہمت بنانے والی جو نصیحتیں 'دہلی اردو اخبار' میں دوران جنگ چھپتی تھیں وہ بھی

مولانا باقر کی لکھی ہوتی تھیں اور خاص طور پر وہ اشتہار جو انگریزوں اور اس کے حامیوں نے دہلی کی جامع مسجد کی دیوار اور دیہاتوں کے تھانے میں مجاہدین کے خلاف جہاد کو غیر شرعی ثابت کرنے کیلئے چسپاں کیا تھا جس کی نقل اور اس کا تفصیلی جواب 5 جولائی 1857 کے دہلی اردو اخبار میں شائع ہوا، وہ بھی مولانا باقر کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔(15)

انگریز پرستی کا الزام

جنگ آزادی 1857 کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کے موقع پر مولوی محمد باقر کے تعلق سے ایک بالکل نئے تنازعہ نے جنم لیا۔ یہ تنازعہ دہلی آرکائیوز میں موجود ایک مکتوب کے حوالے سے علمی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا۔ دراصل یہ خط ایک برطانوی ادیب کے ذریعہ منظر عام پر آیا۔ برطانوی ادیب ولیم ڈلیریمپل نے 1857 کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کی مناسبت سے The Last Mughal کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب ترتیب دی جسے خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی کتاب میں ولیم نے مولوی محمد باقر کے ایک ایسے مکتوب کا ذکر کیا ہے جو ان کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتا ہے۔ اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی محمد باقر انگریزوں کے جاسوسوں کے ذریعہ اعلیٰ حکام کے رابطے میں تھے اور انھیں بہادر شاہ ظفر کو اس بات پر آمادہ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ لال قلعے کے پھاٹک کھول دیں اور انگریزوں کو دوبارہ شہر کا محاصرہ کرنے کی دعوت دیں۔ اس خط کے مطابق مولوی محمد باقر نے بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کا یہ پیغام بھی پہنچایا تھا کہ اگر وہ باغیوں کو تباہ کر دیں تو اس کے عوض انھیں اور ان کی اولادوں کو بڑا فیض پہنچے گا۔

ولیم نے اپنی کتاب میں اس معاملہ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

''بہادر شاہ ظفر کے لیے برطانوی حکام کے ساتھ رابطہ قائم کرنا اور ان کے ساتھ معاہدہ کے امکانات کا پتہ لگانا مشکل نہیں تھا کیونکہ ان کی اہلیہ اور

وزیراعظم پہلے سے ہی ہڈسن کے جاسوس اعلیٰ مولوی رجب علی کے توسط سے مستقل طور پر ریج کے ساتھ رابطے میں تھے۔ باقر (مولوی محمد باقر) نے بھی شاید یہی راستہ اختیار کیا اور ان سے ایک نیوز لیٹر (روزنامچہ) تیار کرنے کو کہا گیا جسے برٹش کیمپ کے محکمہ سراغ رسانی کو بھیجا جانا تھا۔ ایک معاصر ترجمہ سے جو ریج کے وقت میں ہوا اور یہ دہلی کے کمشنر کے دفتر میں باقی رہ جانے والی باقر کی پہلی رپورٹ معلوم ہوتی ہے، پتہ چلتا ہے کہ ان جیسا پرجوش باغی تین مہینے سے کم مدت میں کس طرح بغاوت سے پوری طرح بے تعلق ہوگیا۔ انھوں نے لکھا کہ گائیں ذبح کرنے پر جب ہندو سپاہیوں نے پانچ قصائیوں کو قتل کر ڈالا تو باغی افواج کے ہندو اور مسلمان سپاہیوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔"

ولیم نے جس مکتوب کی بنیاد پر مذکورہ نتائج اخذ کئے ہیں اس کا انگریزی متن ملاحظہ ہو:

"We, the respectable portion of the inhabitants are reduced to the last extremity by the violence of the sepoys, and have no hope of escaping with our lives. The General Bakht Khan's spies dog me wherever I go. There are sentries over the house of Mufti Sadruddin Khan (Azurda) and all exit and entrances prohibited. Through Zinat Mahal I suggested to the King to open the gates and invite the English to come and seize the city, telling him that if he could destroy the mutineers it would be of great advantage to himself and his children. The King approved my advice and promised to do it. But Hakim Ahsanullah Khan, on account of the difference of our faith has prevented any counsels being carried out. The Hakim is a Sunni, the writer of this a Shia."

(DCO archieve, New Delhi. Mutiny Papers, File No. 5028 July 1857, TRANSLATION OF LETTER FROM MUNSHEE MAHOMED BAKAR, 28 JULY, EDITOR OF THE DELHI OORDOO AKHBAR)

ترجمہ: سپاہیوں کے تشدد کی وجہ سے ہم معزز باشندے عاجز ہیں اور ہماری جانیں بچ جانے کی کوئی امید نہیں۔ میں جہاں کہیں جاتا ہوں جنرل بخت خاں کے جاسوس میرا تعاقب کرتے اور مجھے تنگ کرتے ہیں۔ مفتی

صدرالدین خاں (آزردہ) کے گھر کے اوپر سنتری ہیں اور آنے جانے کے تمام راستے ممنوع ہیں۔ میں نے زینت محل کے توسط سے بادشاہ کو تجویز بھیجی کہ پھاٹک کھول دیے جائیں اور انگریزوں کو آنے اور شہر کا محاصرہ کرنے کی دعوت دی جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ باغیوں کو تباہ کر دیں تو یہ ان کے اور ان کے بچوں کے لیے بڑا فائدہ مند ہوگا۔ بادشاہ نے میرا مشورہ منظور کر لیا اور اس پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن حکیم احسن اللہ خاں نے میرے عقیدہ سے اختلافات کی وجہ سے میرے مشورہ پر عمل درآمد پر روک دیا۔ حکیم ایک سنی مسلمان ہیں اور اس (تحریر) کا لکھنے والا شیعہ۔" (16)

(ڈی سی او آرکائیوز نئی دہلی، بغاوت سے متعلق کاغذات۔ فائل نمبر 5028، جولائی 1857۔ منشی محمد باقر کے ایک خط کا ترجمہ 28 جولائی، اڈیٹر 'دہلی اردو اخبار')

ہر چند کہ دہلی آرکائیوز میں اس خط کی موجودگی کی تصدیق ہوئی ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس متنازعہ خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے اور نہ ہی اس پر مولوی محمد باقر کے دستخط موجود ہیں۔ اس خط کے ذریعہ مولوی محمد باقر کے انگریزی حکام سے رابطوں کے بارے میں جو انکشاف کیا گیا ہے اس کی شہادت کسی دوسری دستاویز سے نہیں ملتی اور نہ ہی یہ پتہ چلتا کہ اس رابطہ کی نوعیت کیا تھی اور یہ کب تک قائم رہا اور اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ انگریزوں کی نگاہ میں تو مولوی محمد باقر ایک باغی اور مشتبہ شخص تھے اسی لیے ان کو سزائے موت دی گئی۔

ولیم کی کتاب میں شامل مولوی محمد باقر کے اس متنازعہ خط پر مورخین کو شدید اختلاف ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کی استاد محترمہ شیریں موسوی نے ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیا جو انگریزی ہفتہ وار 'پیپلز ڈیموکریسی' نئی دہلی کی اشاعت 29 اپریل 2007 (شمارہ نمبر 17) میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں 'دہلی اردو اخبار' اور مولوی محمد باقر کے تعلق سے ولیم کی کئی فروگزاشتوں کی گرفت کی گئی ہے۔

محترمہ شیریں موسوی نے ولیم ڈلیریمپل کے گمراہ کن کلمات و تحریرات پر تبصرہ

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ڈلریمپل ایک انگریزی رپورٹ (تاریخ مذکور نہیں) کا حوالہ بھی دیتے ہیں جو محمد باقر کے ایک خط کا ترجمہ لگتا ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ وہ بہادر شاہ ظفر کو انگریز حکام کے ساتھ امن معاہدہ کرنے پر آمادہ کرتے رہے اور حکیم احسن اللہ خاں اس میں رکاوٹ ڈال رہے تھے۔ اس خط میں انھوں نے یہ ذکر بھی کیا ہے کہ ہندو سپاہیوں کے ہاتھوں پانچ قصائیوں کے قتل پر مسلمانوں میں سخت غم و غصہ تھا۔ آیا اس قسم کا خط حقیقت میں باقر کے ذریعہ بھیجا گیا یا نہیں۔ اس کی تصدیق نہیں ہوسکتی لیکن انگریزوں نے کم از کم ان کے ساتھ اپنے مخبر جیسا سلوک نہیں کیا، انھیں پکڑا گیا اور وہ پھانسی پر لٹکا دیے گئے جبکہ حکیم احسن اللہ نے مراعات حاصل کیں۔ باغی اچھی طرح جانتے تھے کہ خط انگریزی حکام کی سازش سے تیار کیا گیا۔ 18 ذی الحجہ مطابق 9 اگست 1857 کے شمارے میں عیدالضحیٰ کے فوراً بعد جب ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ ابھرا تو اس معاملہ پر 'دہلی اردو اخبار' کی اشاعت 18 ذی الحجہ مطابق 9 اگست 1857 کے صفحہ 3 پر نیچے کی طرف شائع ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ ''حکیم احسن اللہ خاں کا انگریزوں کا ایجنٹ ہونا ثابت ہوگیا اور اس لیے فاتح (باغی) فوج نے انھیں گرفتار کرلیا۔''

شیریں موسوی نے مزید لکھا ہے کہ 'دہلی اردو اخبار' میں ذبیحہ گاؤ کا ہلکا سا بھی ذکر نہیں جس کو دہلی میں باغی حکومت کی کچھ تفصیلات میں بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ 'دہلی اردو اخبار' کے شمارہ 11 ذی الحجہ مطابق 9 اگست، عیدالضحیٰ (8 اگست) کے فوراً بعد یا 18 ذی الحجہ میں اس واقعہ کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مدیر نے اس مسئلہ کو بہت سنگین نہیں سمجھا۔ بہر حال یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کے معاصر 'صادق الاخبار' نے اپنے شمارہ 12 ذی الحجہ مطابق 13 ساون میں 'شکریہ' کی سرخی کے ساتھ کیسے اس مسئلہ پر تبصرہ کیا۔

''صد ہزار شکر خدائے بزرگ کا کہ دین کے دشمنوں، بے دین انگریزوں کی شرارت پسندانہ سازشوں کے باوجود عید قرباں کا مقدس دن پر امن طور پر گزر گیا

اور ذبیحہ گاؤ کے مسئلہ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوا۔ دونوں فرقے شیر وشکر کی مانند متحد رہے۔''

اخبار نے اتحاد کی برقراری کی وجہ بہادر شاہ ظفر اور ان کے وزیر اعظم حکیم احسن اللہ خاں کی کوششوں کو قرار دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مدیر، انگریزوں کے ساتھ حکیم کے تعلقات سے ابھی تک باخبر نہیں تھے۔

یہ بات واضح ہے کہ 'دہلی اردو اخبار' دہلی کے باشندوں بالخصوص اس کے تعلیم یافتہ طبقہ۔ اس کے اشراف کے احساسات کو پیش کرتا ہے اور یہ عدیم المثال امر ہے کہ سپاہیوں کے تئیں شروع میں بیگانگی و رنجش کے احساسات کے بعد جیسا کہ سقوط دہلی سے بہت پہلے اس کے صفحات میں شائع ہوئے پھر انھیں سپاہیوں کو وہ اخبار شہر کا بڑا دفاع کار اور محافظ سمجھنے لگا۔ (17)

مذکورہ خط سے مولوی محمد باقر اور حکیم احسن اللہ خاں کے مابین عقیدے کے فرق کی وجہ سے کشیدگی کا احساس ہوتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے تعلقات خوشگوار تھے اور دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ مولوی جعفر علی کے تنازعہ میں مولوی محمد باقر کے ذریعہ دئے گئے اس عدالتی بیان سے ہوتا ہے، جس میں انھوں نے کہا کہ ''میری نیک چلنی حکیم احسن اللہ خاں سے دریافت فرمالیں۔'' اگر مولوی محمد باقر اور حکیم احسن اللہ خاں کے تعلقات کشیدہ ہوتے تو وہ یقیناً عدالت کے روبہ رو ایسا بیان نہیں دیتے۔ عین ممکن کہ یہ خط مولوی محمد باقر کے کردار کو مشتبہ بنانے اور شیعہ سنی تنازعہ کو ہوا دینے کے لیے تیار کیا گیا ہو۔

حوالے

1۔ ڈاکٹر عبدالحق: مرحوم دہلی کالج، دوسرا ایڈیشن 1945، صفحہ: 61

2۔ Sir Abdul Qadir: Famous Urdu Writers & Poets

3۔ جی ڈی چندن: اردو صحافت کا سفر، صفحہ: 55

4۔ آغا محمد باقر: محمد حسین آزاد۔ مقالہ 'نقوش لاہور' شخصیات نمبر 1955، صفحہ: 9

5۔ آغا محمد باقر: مولوی محمد باقر، مطبوعہ ادبی دنیا، لاہور

6۔ دہلی اردو اخبار، 17 مئی 1857، جلد 19، نمبر 20

7۔ مظفر حنفی: محمد حسین آزاد: صفحہ: 15

8۔ ماہنامہ آج کل دسمبر 2007

9۔ امداد صابری، 'اردو کے اخبار نویس' جلد اول، صفحہ: 145

10۔ بلقیس موسوی: 'مولوی محمد باقر' ماہنامہ 'آجکل' دسمبر 2007ء، صفحہ: 19

11۔ بحوالہ 'دہلی اردو اخبار' 28 جنوری 1841ء

12۔ 'اردو کے اخبار نویس' صفحہ: 153

13۔ J NATRAJAN: History of Indian Journalism, Page 58

14۔ غدر کی صبح و شام، صفحہ: 111

15۔ اردو کے اخبار نویس، جلد اول، صفحہ: 156

16۔ The Last Mughal, Page No. 301, 302

17۔ پیپلز ڈیموکریسی (29 اپریل 2007 شمارہ 17) میں شیریں موسوی کا مضمون

Rebel Journalism: Delhi Urdu Akhbar, May- September 1857

صادق الاخبار

'صادق الاخبار' کی تفصیلات میں جانے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ دہلی سے ایک ہی وقت میں اس نام کے دو اخبار جاری ہوئے تھے۔ ہر چند کہ محققین نے 1845 سے لے کر 1856 تک اسی نام کے پانچ اخباروں کی نشاندہی کی ہے، تاہم اس سلسلے میں عتیق صدیقی نے اپنی تحقیق سے یہ حتمی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دہلی سے ایک ہی وقت میں 'صادق الاخبار' نام کے دو اخبار شائع ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک صادق الاخبار کا ایک نمبر اور دوسرے کے تیرہ نمبر نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔ ان دونوں اخباروں میں جو تقریباً ایک ہی تاریخوں کے ہیں، حسب ذیل نمبر شمار اور تاریخیں درج ہیں:

1۔ 'صادق الاخبار'، جلد 3، نمبر 12 مورخہ 23 مارچ 1857

2۔ 'صادق الاخبار'، جلد نمبر 2، نمبر 11 مورخہ 19 مارچ 1857

اس حساب سے معلوم ہوگا کہ جنوری 1857 کے پہلے ہفتہ میں پہلے 'صادق الاخبار' کا اجراء ہوا ہوگا۔ اس کے مالک و مہتمم سید جمیل الدین خاں تھے۔ اور یہ اخبار محلّہ جمیل پورہ عرف چوڑیوالان دہلی سے جاری ہوا تھا۔ (1)

عتیق صدیقی نے نیشنل آرکائیوز میں محفوظ 1857 کی دستاویزوں کا مطالعہ کرنے کے دوران بہادر شاہ ظفر کے ایک حکم نامہ کا حوالہ بھی دیا ہے جس کی رو سے جمیل الدین خاں ایک اور اخبار جاری کرنا چاہتے تھے اور بہادر شاہ نے اس کی اجازت بھی دی تھی لیکن اس اخبار کے اجراء کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

'صادق الاخبار' کے جس دوسرے ایڈیشن کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا اور جس کا ایک شمارہ نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے اس کے اجراء کا سال عتیق صدیقی نے 1857 درج کیا ہے جس کے اڈیٹر شیخ خدا بخش تھے۔ عتیق صدیقی کے بیان کے مطابق:

''مولانا امداد صابری کے کتب خانہ میں بھی 'صادق الاخبار' 14 جنوری 1844 کا ایک شمارہ موجود تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اخبار کم از کم 1844 میں ضرور جاری ہوا ہوگا۔ نیشنل آرکائیوز کے سرکاری کاغذات میں بھی 24 اپریل 1857 کی تاریخ میں ایک 'صادق الاخبار' کا اندراج ملتا ہے۔ جس کے اڈیٹر کا نام شیخ امداد حسین تھا۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ کم از کم 24 اپریل 1847 تک یہ 'صادق الاخبار' بقید حیات تھا۔ (2)

عبدالسلام خورشید 'صادق الاخبار' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''صادق الاخبار کے نام سے دہلی سے غالباً چار اخبار جاری ہوئے۔ اول وہ اخبار جو پہلے فارسی میں تھا اور پھر اردو میں نکلنے لگا۔ دوسرا وہ اخبار جو گارساں دتاسی کے قول کے مطابق 1853 میں جاری ہوا اور جس کے مہتمم مصطفےٰ خاں تھے۔ تیسرا، جو 1854 میں سید جمیل الدین خاں نے جاری کیا تھا اور جو 1857 کے انقلاب میں بے حد مقبول تھا۔ چوتھا جو شیخ خدا بخش نے 1856 میں جاری کیا۔ پہلا 'صادق الاخبار' غالباً 1850 سے پہلے بند ہو چکا تھا۔ دوسرا غالباً ایک سال سے بھی کم عرصہ جاری رہا۔ باقی دونوں اخبار ایک ہی نام سے ایک دوسرے کے دوش بدوش 1857 کے انقلاب کے آخر تک نکلتے رہے، لیکن مقبول عام 'صادق الاخبار' وہی تھا جسے سید جمیل الدین خاں نکالتے تھے۔'' (3)

مولانا امداد صابری نے 'صادق الاخبار' کے تعلق سے مندرجہ ذیل معلومات فراہم کی ہیں۔

''دہلی محلہ چوڑی والان عرف جمیل پورہ سے 1854 کو ایک ہفتہ وار اخبار نمودار ہوا جس کے مالک و مہتمم سید جمیل الدین ہجر تھے۔ یہ اخبار اپنے دور کے

اچھے اخباروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں ملکی و غیر ملکی خبریں شائع ہوتی تھیں اور سنجیدہ و متین مضامین بھی چھپتے تھے۔ اس کا اڈیٹر و مالک خوددار انسان تھا۔ اس کو ملک وقوم سے بے پناہ محبت تھی۔ ظلم و ناانصافی اور غلامی کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ جس وقت جنگ آزادی 1857 دہلی میں شروع ہوئی تو 'صادق الاخبار' نے اپنے صفحات کو جنگ کی خبروں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جنگ کے علاوہ کوئی اور خبر اخبار میں شائع نہیں کی جاتی تھی۔ مجاہدین کی ہمت بڑھانے کے لئے خبریں اور اپیلیں درج کی جاتی تھیں۔ غیر ملکی قوموں کی آمد کی اطلاع چھاپی جاتی تھی۔ دہلی کی جنگ آزادی میں مجاہدین، دشمنوں کا قلع قمع کرتے تھے۔ ایسی خبروں سے اخبار کو مزین کیا جاتا تھا۔" (4)

'صادق الاخبار' کے بارے میں ان بنیادی معلومات کے بعد ہم یہاں جمیل الدین ہجر کے 'صادق الاخبار' کے بارے میں بحث کریں گے جس کا ذکر 1857 کے ضمن میں بار بار آیا ہے اور یہی اخبار بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں بطور ثبوت پیش کیا گیا تھا، لیکن عتیق صدیقی نے امداد صابری کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں زیر بحث آنے والا 'صادق الاخبار' جمیل الدین ہجر کا تھا۔ عتیق صدیقی کا دعویٰ ہے کہ: مولانا امداد صابری کا یہ قیاس درست نہیں ہے کیونکہ بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں پیش ہونے والے 'صادق الاخبار' کا اجراء 1854 میں ہوا تھا۔

بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں 'صادق الاخبار' کے جو اقتباسات شامل کئے گئے تھے، ان پر مشتمل ایک کتاب خواجہ حسن نظامی نے 'غدر دہلی اخبار' کے نام سے شائع کی تھی لیکن اس کتاب میں بھی اخبار کے اڈیٹر اور مالک کا نام درج نہیں ہے، تاہم عتیق صدیقی نے اپنی کتاب 'اٹھارہ سو ستاون اخبار اور دستاویزیں' میں 'صادق الاخبار' کے جو اقتباسات نقل کئے ہیں اس میں خبروں کے آخر میں یہ عبارت درج ہے کہ "جمیل المطابع بہ حکم حضور انور سید جمیل الدین خاں نے طبع کیا۔"

اس سلسلے میں عتیق صدیقی نے 1857 کے اخبارات کا ذکر کرتے ہوئے

'صادق الاخبار' کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''دہلی کا سب سے زیادہ قابل ذکر اخبار 'صادق الاخبار' تھا جس نے بغاوت کے جذبات کی تخم ریزی میں حصہ لیا تھا اور جس نے بغاوت کے دوران باغیوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی تھی۔ بہادر شاہ کے مقدمے کی کارروائیوں میں بھی 'صادق الاخبار' کا متعدد جگہ ذکر اور حوالے ملتے ہیں۔ 11 فروری 1858 کی کارروائی کے دوران میں سرکاری گواہ چنی نے 'صادق الاخبار' کے متعلق جو بیانات دیئے تھے ان کے اقتباسات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔''(5)

عتیق صدیقی نے مولوی ذکاء اللہ کی کتاب 'عروج سلطنت انگلیشیہ' کے حوالے سے یہ حتمی معلومات بہم پہنچائی ہے کہ بغاوت کے بعد 'صادق الاخبار' کے اڈیٹر جمیل الدین پر مقدمہ چلایا گیا اور تین سال قید کی سزا ہوئی۔ اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ 1857 کے حوالے سے جس 'صادق الاخبار' کا تذکرہ بار بار آیا ہے وہ مولوی جمیل الدین ہجر ہی کا اخبار تھا۔

'صادق الاخبار' کے تعلق سے خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ:

''بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں 'صادق الاخبار' کے مضامین کو سرکاری وکیل نے بطور ثبوت شہادت استغاثہ فراہم کیا تھا کیونکہ دورانِ مقدمہ ایک ہندو اخبار نویس نے 'صادق الاخبار' کو بہت گرم اور منہ زور اخبار بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ بادشاہ اور شہزادے اس اخبار کو بہت شوق سے پڑھتے تھے اور عوام میں بھی اس کی بہت مقبولیت تھی، اس کا اڈیٹر ایک مسلمان تھا اور اسباب غدر میں ایک سبب یہ اخبار اور اس کی پرجوش خبریں اور تحریریں بھی سمجھی گئیں۔''(6)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے اپنے اس استدلال کو اسی مقدمے میں یہ کہہ کر لکھ کر کسی قدر الجھا دیا ہے کہ:

''اس اردو پرچے 'صادق الاخبار' کا اڈیٹر برطانوی گورنمنٹ کا دشمن نہ تھا۔ ایسا کوئی مضمون یا کوئی خبر شہادت میں پیش نہیں ہوئی جس میں اڈیٹر نے برطانیہ کے

خلاف کچھ لکھا ہو یا انگریزوں کے خلاف نفرت وعداوت پیدا کرنے کی کوشش اس سے پائی جاتی ہو۔ 'صادق الاخبار' نے صرف ایران وکابل وروس کی خبریں لکھی ہیں اوران پررائے زنی کرنے میں ایک سچے اور صاف گواخبارنویس کی طرح لکھ دیا ہے کہ برطانوی قوت بہت بڑی ہے اوراس کو خطرے میں سمجھنا غلطی ہے۔اس اخبار نے اپنے ناظرین کوخوش کرنے کے واسطے بے عقلی کی کوئی بات نہیں لکھی اور جس چیز میں خلاف عقل مبالغہ معلوم ہوا۔اس کی پرزور تردید کردی اور برطانوی حکومت کا زوراوراس کی خوبیاں ناظرین کوصاف بتادیں تا کہ ان خبروں سے مغالطے پیدا نہ ہوں۔'' (7)

خواجہ حسن نظامی نے 'صادق الاخبار' کوایک مصلحت کوش اخبار ثابت کرنے کے لئے کئی دلائل پیش کئے اور بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں اس اخبار کے اقتباسات کو استغاثہ کی تائید کے خلاف قرار دیا کیونکہ بقول ان کے اس اخبار نے افواہوں کی اعلانیہ تکذیب کی ہے اوران کوخلاف عقل بتایا ہے۔خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب 'غدر کے اخبار' میں 'صادق الاخبار' کے عین غدر کے دن کے اقتباسات کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ بیان ملاحظہ ہو:

''بہت تعجب خیز نکتہ ان اقتباسات میں یہ ہے کہ 'صادق الاخبار' کے وہ مضامین بھی منتخب کئے گئے ہیں جوعین غدر کے دن اور غدر کے چار مہینہ بعد شائع ہوئے مگران مضامین میں بھی برٹش گورنمنٹ کے خلاف ایک لفظ نہیں ہے۔حالانکہ اخبارنویس کوغدر کے بعد جبکہ انگریزوں کا نشان بھی باقی نہ رہا تھا اور تمام ملک میں برٹش سلطنت ایک امید وبیم بلکہ نابود ہونے کے خطرے میں پڑی ہوئی تھی اور جبکہ ہندو مسلمان دونوں کوانگریزوں کا کچھ خوف باقی نہ رہا تھا۔ پھر بھی 'صادق الاخبار' میں برٹش گورنمنٹ کے خلاف کوئی مضمون نہیں چھپا۔اگر چھپتا تو سرکاری وکیل اس کو استغاثہ کی شہادت میں ضرور پیش کرتا۔'' (8)

اپنی اس مختصر کتاب میں خواجہ حسن نظامی نے 'صادق الاخبار' کے اڈیٹر کواس اعتبار

سے ایک اعلیٰ دماغ شخص قرار دیا ہے کہ اس میں جذباتیت اور جوش برائے نام بھی نہیں تھا اور وہ غدر کے حالات کو احتیاط کے ساتھ عقل کی کسوٹی سے پرکھ کر دیکھ رہا تھا۔ کتاب کے مقدمے میں اخبار کے اڈیٹر کو ایک بڑی اخلاقی قوت کا مالک قرار دیتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''صادق الاخبار' کی اس خاموشی اور احتیاط سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس کے اڈیٹر کی نظر بہت گہری تھی اور وہ نہایت تجربہ کار اور فوجی وملکی حالات کا بہت اچھا مبصر تھا اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ موجودہ غدر برٹش سلطنت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور ہندوستان کی فوجی وسیاسی تدابیر انگریزوں کے فوجی اور سیاسی توڑ جوڑ پر فتح نہیں پاسکتیں۔ اس واسطے اس نے کوئی مضمون غدر کرنے والوں اور ان کے حامیوں کی تائید میں نہیں لکھا۔ یہ بات بھی ہندوستانی اخبار نویسوں کے لئے باعث فخر ہوسکتی ہے کہ ان میں اس دل و دماغ کے اڈیٹر ہوسکتے ہیں جیسا کہ 'صادق الاخبار' کا اڈیٹر تھا۔'' (9)

قابل غور بات یہ ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے 'غدر دہلی کے اخبار' میں 'صادق الاخبار' کے جو اقتباسات نقل کئے ہیں وہ اصل اخبار سے نہیں لئے گئے ہیں بلکہ یہ پہلے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کئے گئے تھے اور بعد میں انہوں نے اسے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرایا۔ یہ وہ اقتباسات ہیں جنہیں سرکاری وکیل نے عدالت میں پیش کیا تھا اور بہادر شاہ کے مقدمے کی مثل میں شامل تھے، جو ایک ضخیم کتاب کی صورت میں سرکاری طور پر انگریزی میں شائع ہوئی تھی۔ ان اقتباسات کے حوالے سے خواجہ حسن نظامی کا یہ بیان توجہ کا طالب ہے کہ:

''سمجھ میں آسکتا ہے کہ کئی کئی دفعہ کی الٹ پھیر میں 'صادق الاخبار' کی اصلی طرز تحریر کا رنگ بالکل بدل گیا ہوگا اور وہ کیفیت ترجمہ کے اس تیسرے قالب میں نہیں آسکتی جو 'صادق الاخبار' کی اصل اردو میں ہوگی۔'' (10)

خواجہ حسن نظامی نے 'غدر دہلی کے اخبار' کا جو مقدمہ تحریر کیا ہے اس میں سارا زور

اسی ایک بات پر صرف کر دیا گیا ہے کہ 'صادق الاخبار' کا اڈیٹر انگریز دشمن ہرگز نہیں تھا اور وہ ان معنوں میں ایک دور اندیش شخص تھا کہ اسے انگریزوں کی طاقت اور ہندوستانیوں کی کمزوریوں کا علم تھا۔ خواجہ حسن نظامی کی اس رائے پر بعد کے کسی محقق نے مہر تصدیق ثبت نہیں کی۔

عتیق صدیقی نے اپنی معرکتہ الآراء کتاب 'اٹھارہ سو ستاون، اخبار اور دستاویزیں' میں 'صادق الاخبار' کے چھ شماروں کا مکمل متن شائع کیا جبکہ خواجہ حسن نظامی کی رسائی 'صادق الاخبار' کے انہی اقتباسات تک ہو سکی جو بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں استغاثہ کی طرف سے انگریزی زبان میں پیش کئے گئے تھے۔ عتیق صدیقی کی کتاب میں شائع شدہ تفصیلی اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'صادق الاخبار' نے خواجہ حسن نظامی کی رائے کے برعکس اعلانیہ طور پر مجاہدین کا ساتھ دیا اور اس کی ہمدردیاں قلعہ معلیٰ اور بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہو گئیں۔ یہی نہیں اخبار نے بادشاہ کی کامیابی کی نوید دینی شروع کر دی۔ 'صادق الاخبار' کی اشاعت 14 ذی الحجہ 1373 ہجری کے شمارے کی پہلی خبر ملاحظہ ہو۔ سرخی ہے: 'خواب'

"ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ان دنوں میں نے خواب دیکھا کہ ایک بزرگ متبرک صورت میرے پاس آئے اور گویا ہوئے کہ تم لوگ کس لئے اتنا ڈرتے ہو۔ قادر علی الاطلاق نے تو بادشاہت ہند کی ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی کے نام عطا کر دی۔ میں یہ سن کر شکر خداوندی بجالایا اور استفسار کیا کہ حضرت یہ تو فرمائیے کہ آپ کے ہاتھ سیاہ کیوں ہو گئے؟ یہ جواب سن کر خضر صورت ملائک سیرت بولے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ خبر دی کہ تمہارے دشمن تم پر گولہ برساتے ہیں تو میں ہاتھوں سے روکتا ہوں اور یہی باعث ہے کہ رعایا دہلی میں سے کم لوگ ضائع ہوتے ہیں۔"

قابل ذکر ہے کہ مذکورہ شمارے کی دیگر خبریں بھی انگریز مخالف ہیں اور ان میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان انگریزوں سے برسر پیکار ہوں۔ مثال کے طور پر

'کلام پیغمبر' کے عنوان سے ایک خبر میں رسول اللہؐ کے یہ ارشادات نقل کئے گئے ہیں:

"فرمایا آنحضرتؐ نے کہ قتل کر رنج دینے والے کو جس طرح کہ وہ تیرے رنج دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب چاہئے کہ تمام پیر و جوان خورد و کلاں، عقل منداور جاہل، کسان اور سپاہی بغیر از تامل تائید کریں اور اپنے ہم مذہبوں کی اور ہتھیاروں سے جسم کو آراستہ رکھیں اور ایک جھنڈا محمدی گاڑیں اور تمام ہم قوم کو جہاد کی اطلاع دیں۔ خدا کے نام پر کہ وہ برکت دے نمازیوں کو اور ہم ان سے خوش ہوں گے۔"(11)

'صادق الاخبار' کی مذکورہ خبر میں آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ:

"......خدا نے چاہا تو فتح مند ہوں گے اور انگریز کا ٹھکانہ لندن سے ورے نہ رکھیں بس اب یہ وقت ہے کہ باشندے اوس ملک اور افغان و اہل ہند جو کہ قرآن شریف پر ایمان رکھتے ہیں اور فرمودہ پیغمبر خدا پر چلتے ہیں، الم نشرح جہاد کریں اور دین کا ساتھ دیں اور اپنے بھائی مسلمانوں کے دستگیر بنیں کہ اس میں مفاد دین و دنیا مقصود ہے۔"(12)

'صادق الاخبار' نے کھلے عام مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دی اور اپنی تحریروں میں جابجا مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض کے حوالے سے غلامی کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے کہا۔ 'حدیث' کے زیر عنوان سے مذکورہ تاریخ کے ہی اخبار میں یہ خبر ملاحظہ ہو۔

"فرمایا حضرت پیغمبرؐ نے کہ جو کوئی اہل مذہب کی مدد کرے گا۔ ثمرہ اوس کا نیک پاوے گا۔ اور قبل از اجرائے اشتہار کے امیر دوست محمد خاں کہا کرتا تھا کہ اگر سپاہ ایران انگریزوں پر چڑھائی کرے گی تو میں بھی زور زور سے اوس کا شریک ہوں گا۔ اب وہ وقت آن پہنچا ہے۔ سو امیر دشمنان اہلِ اسلام کو ہلاک کرے۔ جہاں تک ہو سکے کہ اس سے بہتر کوئی نعمت عظمیٰ نہیں، کس لئے کہ اگر مر جائے تو رتبہ شہادت پائے اور اگر زندہ بچے تو غازی کہلائے، بہرحال جہاد اچھی چیز ہے۔"

دوران انقلاب ہندوستانیوں کو ایران سے مدد کی امید تھی اور یہ توقع بھی تھی کہ امیر افغانستان دوست محمد خان جو انگریزوں کا ہمنوا تھا، بحیثیت مسلمان ایرانیوں کی معاونت کرے گا، چنانچہ اس حوالے سے یہ خبر جو کہ 'نامہ' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے ملاحظہ ہو:

"اے امیر تو انگریزوں سے شریک ہو کر بے ایمان ہو گیا۔ مگر ہم از راہ مسلمانی تجھ کو فہمائش کرتے ہیں کہ اس قوم سے علیحدہ ہو اور ہم سے مل کر تدبیر غارت کرنے انگریزوں کی کر اور کل اہل اسلام بھی کہتے ہیں کہ امیر نے انگریزوں سے مل کر مسلمان کا نام ڈبویا۔ اگر تجھ کو طمع زر ہے تو ہم سے دو چند لے اور کیا تو نے نہیں سنا کہ اس قوم نے ہندوستانی شاہزادوں اور امیروں سے کیا کیا بدعہدیاں ظاہر کیں۔"

مذکورہ بالا اقتباسات اور خبروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ 'صادق الاخبار' انگریزوں کے خلاف کس حد تک نفرت اور عداوت رکھتا تھا اور بہر صورت ایسی خبروں کی اشاعت کو ترجیح دیتا تھا، جن سے عوام الناس کے اندر انگریزوں کے خلاف لڑنے کا جذبہ پیدا ہو اور وہ اسے ایک مذہبی فریضہ جانیں۔

جہاد کا فتویٰ

'صادق الاخبار' نے 35 جید علمائے دین کا وہ فتویٰ بھی شائع کیا تھا جس میں انگریزوں کے خلاف انقلابی سپاہیوں کی جنگ کو جہاد سے تشبیہ دی گئی تھی۔ یہ فتویٰ صادق الاخبار پنجم ماہ ذی الحجہ 1273 ہجری جلد نمبر 4 شمارہ نمبر 4 میں شائع ہوا ہے۔ فتویٰ کا متن جو کہ نقل استفتاء کے نام سے شائع کیا گیا ہے اس طرح ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں اور وہ فرض ہے تو فرض عین ہے یا نہیں اور راو پر لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہئے یا نہیں۔ بیان

کرو، اللہ تم کو اجر دے۔"

جواب: درصورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اوس کی فرضیت کے واسطے چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بہ سبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجودہ ہونے والے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف وحوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائیگا اور اس طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل و غارت کا ارادہ کریں تو اوس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا۔ بہ شرط ان کی طاقت سے۔

دستخط علمائے کرام

احقر العباد نور جمال عفی عنہ، العبد محمد عبد الکریم، فقیر سکندر علی، سید محمد نذیر حسین، رحمت اللہ، مفتی محمد صدر الدین، مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی، محمد ضیاء الدین، عبد القادر، فقیر احمد سعید احمدی، محمد میر خاں، العبد مولوی عبد الغنی، خادم العلماء محمد علی، فرید الدین، محمد سرفراز علی، سید محبوب علی جعفری، محمد الواحد حامی الدین، العبد سید احمد علی، الٰہی بخش، محمد کریم اللہ، مولوی سعید الدین، محمد مصطفٰے خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی، محمد انصار علی، مولوی سعید الدین، حفیظ اللہ خاں، محمد نور الحق چشتی، محمد ہاشم، حیدر علی، سید محمد، محمد امداد علی عفی عنہ، سید عبد الحمید عفی عفا اللہ عنہ، محمد رحمت اللہ خاں عفی عنہ عدالت عالیہ سراج العلماء ضیاء الفقہا، محمد حسین رسول الثقلین قاضی القضاۃ خادم شرع شریف۔ (13)

اس فتوے پر مذکورہ 28 علمائے کرام کے دستخط اور مہریں شائع ہوئی تھیں۔

'صادق الاخبار' کی ان خبروں اور سرگرمیوں سے بخوبی اندازہ ہے کہ اس نے 1857 کی جنگ آزادی میں کھل کر مجاہدین کا ساتھ دیا۔ ذرا اس خبر کے تیور ملاحظہ کیجئے۔

''دیکھواس کی (پروردگار کی) ادنیٰ عنایت کو، سولھویں رمضان المبارک 1273 ہجری کو پانچ ترک سواران فرشتہ منش نے انگریزوں کا راج پاٹ ہند سے اٹھادیا۔ گویا تختۂ حکومت الٹ دیا اور ہمارے حضرت قدر قدرت بہ یاوری طالع از سرنو تخت شاہی پر بیٹھے از آں جا کہ آسائش رعایا ہند منظور خدا ہے۔ اس لئے منتظم دوراں جناب محمد بخت خاں بہادر جنرل کو کہ نصفت اور عدالت اور مدبری و انتظام میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ہمارا حاکم شفیق بنایا اور جناب موصوف نے حضور سے خلعت فاخرہ سپر د شمشیر پائی ہے۔ پاتے ہی شہر کا انتظام بہ خوبی کر دیا۔ اب کوئی کسی پر زیادتی نہیں کرتا بلکہ الٹا سرکش غریب کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھ کر ڈرتا ہے اور تمام سپاہ کا بھی بندوبست بخوبی ہو گیا ہے۔ جمیع تھانا دار شہر اور سید مبارک شاہ خاں صاحب کوتوال گشت وَ ززِ ندہ ہیں مصروف ہیں اور دکاندار دکانیں کھولتے جاتے ہیں۔ باہر سے غلہ بہ افراط چلا آتا ہے اور حال لڑائی کا یہ ہے کہ پرسوں کے روز جناب جرنیل صاحب نے بہ راہ علی پور گوروں کا محاصرہ کیا تھا۔ سو طرفین سے مقابلہ ہوا۔ دیر تک سپاہ شاہی دادِ شجاعت دیتے رہے آخر کار گورے بھاگ نکلے۔'' (14)

کیا اس اقتباس کے بعد بھی خواجہ حسن نظامی کی اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ 'صادق الاخبار' انگریزوں کا دشمن نہیں بلکہ مصلحت کوش تھا اور اس نے انگریزوں کے خلاف عین 1857 کے دوران کوئی مخالفانہ کردار ادا نہیں کیا؟

قلعہ معلیٰ سے سازش

1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد 'صادق الاخبار' پر سرکار کی بدخواہی میں جھوٹی اور بے بنیاد خبریں چھاپنے کا الزام عائد کیا گیا۔ اس کی پاداش میں اڈیٹر سید جمیل الدین ہجر کی گرفتاری عمل میں آئی اور انہیں تین ماہ کے لئے قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔

سرکاری وکیل نے مقدمہ بہادر شاہ ظفر میں بحث کے دوران 'صادق الاخبار' کے

اقتباسات نقل کرتے ہوئے کہا کہ:

''حضرات آپ کو یاد ہوگا 'صادق الاخبار' کی کاپیاں محل میں جایا کرتی تھیں اور ہر ایک شخص ان خوشیوں کا اندازہ لگا سکتا ہے جو ایسی خبریں پڑھ کر ہو سکتی ہیں خصوصاً اس قسم کی خبریں کہ زار روس چار لاکھ جرار لے کر آ رہا ہے نیز تسخیر ہند کے لئے ایرانیوں کی مدد پہنچنے والی ہے وغیرہ اور صرف اہل قلعہ یا شہزادوں ہی کو ان خبروں کو سننے سے خوشی نہیں ہوتی تھی بلکہ تمام آبادی ایسی خبروں کو سنتی تھی اور مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتی تھی۔''(15)

سرکاری وکیل میجر ایف جی ہیریٹ نے فوجی عدالت میں جو طویل بیان دیا اس میں 1857 کے انقلاب کی وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ یہ انقلاب جن وجوہ کی بنا پر برپا ہوا اور اسے شہ ملی اس میں قلعہ معلّٰی اور صحافت کے درمیان سازش کارفرما تھی۔ 1857 سے قبل کے اخباری تراشوں کا حوالہ دیتے ہوئے وکیل استغاثہ نے دلیل دی کہ اخبارات نے جنوری کے مہینے میں یہ خبر درج کی کہ روس اور ترکی انگریزوں کے خلاف جنگ میں ایران کی مدد کریں گے اور شہنشاہ روس نے چار لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج اس مہم کے لئے تیار کی ہے۔ اسی اخبار نے بتایا کہ شاہ ایران نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کون کون سے درباری کو ممبئی، کلکتہ اور پونہ کی گورنری سونپی جائے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ بادشاہ ہندوستان بھر کا بادشاہ ہوگا۔ مارچ میں اسی اخبار نے خبر چھاپی کہ نو سو افراد اور سپاہی ہندوستان میں داخل ہو چکے ہیں اور پانچ سو افراد سپاہی کا بھیس بدل کر خود دہلی میں موجود ہیں۔ وکیل استغاثہ نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کیا کہ قلعہ معلّٰی اور صحافت کے درمیان کوئی سازش نہیں ہوئی اور جو کچھ ہوا اتفاقی تھا چنانچہ 'صادق الاخبار' کے اڈیٹر جمیل الدین ہجر کو تین سال قید کی سزا سنا دی گئی۔

جمیل الدین ہجر

سید جمیل الدین ہجر میر اسرار علی کے بیٹے تھے۔ ان کا شمار اکابر سادات کرام اور

شرفاء و معززین میں ہوتا تھا۔ نستعلیق نگاری اور نستعلیق گوئی میں بے مثل تھے۔ ان کے آباء و اجداد شہاب الدین غوری کے عہد حکومت میں بغداد سے ہندوستان آئے تھے اور معزز عہدوں پر فائز ہوئے۔ دہلی سے قریب قصبہ ڈاسنہ میں قیام کیا۔ ان کے والد دہلی میں نواب بہادر جنگ خاں والی بہادر گڑھ کی سرکار میں عہدہ وکالت سے سرفراز ہوئے اور ایک زمانے تک اس عہدہ کو حسن لیاقت سے سرانجام دیا۔ اس کے بعد طبیعت کی بے نیازی اور استغنائے مزاج کے سبب گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ (16)

جمیل الدین ہجر کی پوری زندگی اخبار نویسی میں گزری۔ انہوں نے قید و بند سے رہائی کے بعد میرٹھ میں سکونت اختیار کی اور وہاں 1861 میں محب کشور ہند نام سے ایک پریس قائم کیا جس کے مالک مولوی سید اقبال الدین احمد اور منیجر سید ہدایت علی تھے۔ جمیل الدین ہجر نے 1864 میں میرٹھ کے محلہ بڈھانہ پشت بازار سے آٹھ صفحات پر مشتمل اخبار 'لارنس گزٹ' جاری کیا جس کے اڈیٹر منشی مشتاق اور سب اڈیٹر منشی نثار علی تھے۔ بعد ازاں 1872 میں یہیں سے چار صفحات پر مشتمل ہفتہ وار اخبار 'محب ہند' شائع کیا جو ہر جمعہ کو نکلتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ چار روپے آٹھ آنے تھا۔ (17)

جمیل الدین ہجر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بڑے لائق اور قابل و تجزیہ کار مدیروں میں شمار ہوتے تھے اور شعراء میں بھی ان کا نام لیا جاتا تھا۔ 3 مارچ 1857 کے 'صادق الاخبار' میں ان کی غزل شائع ہوئی جس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

ہوں تشنہ الفت نہ دے کوثر میں سے پانی
دینا ہے تو دے اپنے ہی خنجر میں سے پانی

حوالے

1۔ 'ہندوستانی اخبار نویسی'، صفحہ:258
2۔ ایضاً، صفحہ:284
3۔ 'صحافت پاکستان و ہند میں'، صفحہ:110
4۔ 'اردو کے اخبار نویس'، صفحہ:247
5۔ ایضاً، صفحہ:402
6۔ مقدمہ 'غدر دہلی کے اخبار'، صفحہ:1
7۔ ایضاً، صفحہ:2
8۔ ایضاً، صفحہ:4
9۔ ایضاً، صفحہ:4
10۔ ایضاً، صفحہ:4
11۔ 'صادق الاخبار'، 14 ذی الحجہ 1273 ہجری
12۔ محولہ بالا، از اٹھارہ سو ستاون، اخبار اور دستاویزیں، صفحہ:154
13۔ 'صادق الاخبار' پنجم ماہ ذی الحجہ 1273 ہجری جلد 4 شمارہ نمبر 4
14۔ 'صادق الاخبار'، 14 ذی الحجہ 1273 ہجری
15۔ 'اردو کے اخبار نویس'، صفحہ:249 تا 250
16۔ 'گلشن سخن'، صفحہ:484
17۔ 'اختر شہنشاہی'، صفحہ:236

پیامِ آزادی

تحریک آزادی 1857 میں نئی روح پھونکنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع کرنے کے سلسلے میں 'پیامِ آزادی' کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا بیدار بخت کے حکم سے اس اخبار کی اشاعت فروری 1857 میں شروع ہوئی تھی۔ 'پیام آزادی' کے پبلشر گو کہ مرزا بیدار بخت تھے لیکن اس کے خاص نگراں عظیم اللہ خاں تھے جو اس تحریک کے عظیم قائد اور سپہ سالار تھے۔ اسی زمانے میں بہادر شاہ ظفر کا اعلانِ آزادی بھی 'پیام آزادی' میں شائع ہوا تھا جس کی ایک کاپی 'لندن ٹائمز' کے خصوصی نمائندے سر ولیم رسل نے اپنے اخبار کو بھیجی تھی۔ ملاحظہ ہو:

''ہندوستان کے ہندوؤ اور مسلمانو اٹھو۔ بھائیو، اٹھو خدا نے انسان کو جتنی برکتیں دی ہیں، ان میں سے سب سے زیادہ قیمتی برکت آزادی کی ہے۔ وہ ظالم فرنگی جس نے دھوکے سے ہم سے یہ برکت چھین لی ہے، کیا ہمیشہ کے لیے ہمیں اس سے محروم رکھ سکے گا۔ نہیں کبھی نہیں۔ فرنگیوں نے اتنے ظلم کئے ہیں کہ ان کے گناہوں کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے۔ خدا اب نہیں چاہتا کہ تم خاموش رہو۔ کیونکہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کو اپنے ملک سے نکالنے کی خواہش پیدا کر دی ہے اور خدا کے فضل سے تم لوگوں کی بہادری سے جلد ہی انگریزوں کو اتنی کامل شکست ملے گی کہ ہمارے ملک ہندوستان میں ان کا ذرا بھی نشان نہیں رہ جائے گا۔''

ہندی روزنامہ 'نو بھارت ٹائمز' کی اشاعت 14 و 15 دسمبر 1992 میں 'جدو جہد آزادی میں اردو صحافت کا حصہ' کے زیر عنوان ایک طویل مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا تھا جس میں 'پیامِ آزادی' کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ مؤرخ اور صحافی ڈاکٹر سنت کمار نے بھی 'پیامِ آزادی' پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے:

"جدو جہد آزادی میں اردو صحافت کی شاندار تاریخ 'پیام آزادی' سے شروع ہوتی ہے، جو فروری 1857 سے دلی کے بادشاہ کے پوتے مرزا بیدار بخت کی ادارت میں شائع ہونے لگا تھا۔ یہ دیوناگری اور فارسی رسم الخط میں شائع ہوتا تھا اسی لئے یہ ہندی اور اردو صحافت کی مشترکہ میراث ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اب اس کے شمارے کہیں دستیاب نہیں ہیں۔ اس لئے اس اخبار پر لکھنے کے لئے ہمیں انگریزی مؤرخین، اخبار نویسوں کے مضامین اور حوالوں کو ہی بنیاد بنانا پڑتا ہے۔ یہ آزادی کا بگل بجانے والا ہندوستان کا پہلا اخبار تھا اور اس کے مدیران اور قارئین نے شہادت قبول کر کے قومی صحافت کے پرچم کو سر بلند کیا تھا۔"(1)

'پیام آزادی' وسائل کے فقدان اور مخالف حالات میں بھی دہلی سے دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں شائع ہوتا تھا۔ ستمبر 1857 میں جھانسی سے اس کا مراٹھی اڈیشن بھی شائع کیا جانے لگا۔ عظیم اللہ خاں نے 1857 میں یوروپ میں اس کی اشاعت منصوبہ بندی کی تھی۔ عظیم اللہ کی ملاقات 'لندن ٹائمز' کے خصوصی نمائندے سر ولیم ہاورڈ رسل سے ہوئی تھی جنھوں نے اپنی کتاب 'دی واران کریمیا' میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں سیاسی اخبارات کی کمی سے عظیم اللہ خاں خاص طور پر فکر مند تھے۔

سندر لال نے اپنی ہندی کتاب 'بھارت میں انگریزی راج' میں بی ڈی باسو کی کتاب Rise of Christian Power in India کے حوالے سے 'پیام آزادی' کے حوالے دیے۔ 1857 کی جنگ آزادی کی صدی تقریبات کے موقع پر 1957 میں مشہور مورخ بشمبر ناتھ پانڈے نے برٹش میوزیم میں تلاش کرایا لیکن وہاں بھی اس اخبار کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہوا۔ جدو جہد آزادی کے صحافیوں پر ایک مضمون ستیہ دیو ودیالنکار کا

شائع ہوا جس میں انھوں نے لکھا کہ 'پیام آزادی' کے جو شمارے برٹش میوزیم میں 1936 تک محفوظ تھے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ پیام آزادی کے تیسرے شمارے میں ہندوستان کے بادشاہوں کے اتحاد کے سلسلے میں عظیم اللہ خاں کا ایک بیان شائع ہوا تھا۔ انہی شماروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے اس سب سے پہلے قومی اخبار کی اشاعت فروری 1857 میں شروع ہوئی اور بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا بیدار بخت کے دستخطی پروانے سے یہ شائع ہوتا تھا یعنی موجودہ اصطلاح میں بادشاہ کے حکم سے مرزا بیدار بخت اس اخبار کے اڈیٹر پرنٹر اور پبلشر نامزد کیے گئے تھے۔

'پیام آزادی' بنیادی طور پر 1857 کی جدوجہد آزادی کا ترجمان تھا۔ اسی لئے انگریزی اور ہندی کے مؤرخین نے اسے ہندوستان کا پہلا قومی اخبار قرار دیا ہے۔ اس اخبار میں ہندو مسلم یکجہتی پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ جی بی میلیسن کی کتاب The Red Pumphlet میں شائع شدہ 'پیام آزادی' کے اداریہ کے ان الفاظ سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے:

> ''ہند کے باشندو! عرصے سے جس کا انتظار تھا، آزادی کی وہ پاک گھڑی آن پہنچی ہے۔ ہندوستان کے باشندے اب تک دھوکے میں آتے رہے اور اپنی ہی تلواروں سے اپنا گلا کاٹتے رہے۔ اب ہمیں ملک فروشی کے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہئے۔ انگریز اب بھی اپنی دغابازی سے کام لیں گے۔ وہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف ابھارنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن بھائیو! ان کی چالوں اور فریب میں مت آنا۔ ہندو اور مسلمان بھائیو! اپنے چھوٹے چھوٹے تفرقوں کو بھول جاؤ اور میدان جنگ میں ایک جھنڈے کے نیچے کھڑے ہو جاؤ۔''(2)

'پیام آزادی' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک بے باک اور بے لاگ اخبار تھا۔ انگریزوں کی عیاری اور مکاری کو اس نے بخوبی سمجھ لیا تھا اور وہ ہندوستانی باشندوں پر برملا ان سازشوں کا انکشاف کرتا تھا جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو نقصان پہنچا کر

اپنا مفاد حاصل کرنے کی غرض سے انگریزوں نے تیار کی تھیں۔

1858 میں لندن سے The Narrative of the Indian Revolt نامی کتاب شائع ہوئی تھی جس میں پیام آزادی کا ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ یہ دراصل ایک اپیل ہے جس کی زبان اور لہجہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اخبار ہندوستانی باشندوں اور بالخصوص اس جنگ میں شامل مجاہدین کے حوصلوں کو بلندی کی کس سطح تک لے جانا چاہتا تھا۔ اسے اپنے دور کی صحافت کی بے باکی کا نقطہ عروج بھی کہا جا سکتا ہے۔ روہیل کھنڈ کی پلٹنوں سے جنگ آزادی میں شامل ہونے کی اس اپیل میں کہا گیا ہے کہ:

"بھائیوں دلّی میں فرنگیوں کے ساتھ آزادی کی جنگ ہو رہی ہے۔ اللہ کی مہربانی سے ہم نے انھیں جو پہلی شکست دی ہے، اس سے وہ اتنے گھبرا گئے ہیں کہ جتنا کسی دوسرے وقت وہ دس شکستوں سے نہیں گھبرائے۔ بے شمار ہندوستانی بہادر دلی میں آ آ کر جمع ہو رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر آپ وہاں کھانا کھا رہے ہیں تو ہاتھ یہاں آ کر دھویئے۔ ہمارے کان اسی طرح آپ کی طرف لگے ہوئے ہیں جس طرح روزہ داروں کے کان موذن کی اذان کی طرف لگے رہتے ہیں۔ ہم آپ کی توپوں کی آواز سننے کو بے چین ہیں۔ ہماری آنکھیں آپ کے دیدار کی پیاسی سڑک پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ فوراً آیئے"

روہیل کھنڈ کی پلٹنوں سے آزادی کی جنگ میں شامل ہونے کی یہ دردمندانہ اپیل شائع کرنا برطانوی اقتدار کو براہ راست چیلنج دینا ہی کہا جائے گا۔

'لندن ٹائمز' کے اڈیٹر جان ڈلین کے نام سر ولیم رسل نے جو خط لکھنؤ سے لکھا تھا اس میں 'پیام آزادی' میں شائع بہادر شاہ ظفر کا مذکورہ بالا اعلان بھی منسلک تھا۔ جدوجہد آزادی کی رپورٹنگ کے لیے 'لندن ٹائمز' نے سر ولیم رسل کو ہی اپنا خصوصی نمائندہ بنا کر ہندوستان بھیجا تھا۔ بادشاہ کا اعلان پیام آزادی میں شائع ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ اخبار جنگ آزادی کا ترجمان بھی کہا جا سکتا ہے۔

'پیام آزادی' کی طاقت ہندو مسلم اتحاد کی طاقت تھی جس سے انگریز دہشت زدہ ہو کر تلملا گیا تھا۔ سر ہینری کاٹن نے اپنی کتاب Indians and Home Memories میں لکھا ہے کہ انگریزوں نے جب واپس دہلی پر قبضہ پایا تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان سبھی لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا جن کے گھروں سے 'پیام آزادی' کا ایک شمارہ بھی برآمد ہوا۔ سب سے دردناک کہانی 'پیام آزادی' کے مدیر بیدار بخت کی ہے۔ سر ولیم ہاورڈ نے اپنی ڈائری کے دوسرے حصے میں لکھا ہے کہ: ''دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد 'پیام آزادی' کے اڈیٹر مرزا بیدار بخت کے جسم پر سور کی چربی مل کر انھیں پھانسی دیدی گئی۔'' عوام الناس کی یاد داشت میں 'پیام آزادی' میں شائع ہونے والے عظیم اللہ خاں کے متعدد گیت ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے۔ 'پیامِ آزادی' کے اوّلین شمارے میں عظیم اللہ خاں کا جو گیت شائع ہوا تھا اس کا ایک بند اس طرح ہے۔

ہم ہیں اس کے مالک ہندوستاں ہمارا — پاک وطن ہے قوم کا، جنت سے بھی پیارا
یہ ہے ہماری ملکیت ہندوستاں ہمارا — اس کی اہمیت سے روشن ہے، جگ سارا
آیا فرنگی دور سے ایسا منتر مارا — لوٹا دونوں ہاتھوں سے پیارا وطن ہمارا
آج شہیدوں نے تم کو اہل وطن للکارا — توڑ و غلامی کی زنجیریں، برساؤ انگارا

ہندو مسلماں، سکھ ہمارا بھائی، بھائی پیارا
یہ ہے آزادی کا جھنڈا اسے سلام ہمارا

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردو صحافت پر تحقیقی کام کرنے والوں نے اب تک 'پیام آزادی' کے بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں کی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی کہ 'پیام آزادی' کا کوئی شمارہ کہیں دستیاب نہیں ہے۔ راقم الحروف نے جب پہلی بار اپنے مضمون (مطبوعہ آج کل اگست 2007) میں اس اخبار کی تفصیلات قلم بند کیں تو اس موضوع پر کام کرنے والوں نے اس کی پذیرائی کی اور اسے آگے بڑھانے کے لئے کہا۔ سب سے پہلے جناب گربچن چندن نے اس کی تحسین کی۔ بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ صحافت اور ابلاغ عامہ کے سربراہ پروفیسر شافع قدوائی نے اس کوشش کو سراہا۔ (3)

حوالے

1۔ 'بھارتیہ پتر کاریتا کل آج اور کل'، صفحہ: 263-265

2۔ جی بی میلسن: 'دی ریڈ پمفلٹ' بحوالہ 'بھارتیہ پتر کاریتا، صفحہ: 264

3۔ راقم الحروف کے نام ڈاکٹر شافع قدوائی کے خط مورخہ 25 جولائی 2007 کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''آج کل کے تازہ شمارے میں آپ کا مضمون 'صادق الاخبار اور پیام آزادی' نظر سے گزرا۔ آپ نے 'پیام آزادی' کو جس پر فراموش کاری کی گہری مستو دھند تھی۔ موضوع تحقیق بنا کر ایک اہم علمی فریضہ انجام دیا ہے۔ اردو اور انگریزی میں موجود صحافت کی تاریخ کی کتابیں اس اہم اخبار کے ذکر سے عاری ہیں۔ مارگریٹ بارنس اور طاہر مسعود تک نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ پیام آزادی کے بعض شمارے شاید وکٹوریہ میموریل (کلکتہ) میں موجود ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں کوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ملی۔ آپ نے دقت نظر کے ساتھ پیام آزادی کے مندرجات پر اظہار خیال کیا ہے۔ آپ کا مضمون مجھے بے حد پسند آیا۔ مبارکباد قبول کیجئے۔''

سراج الاخبار

1857 کی جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے اخباروں میں 'سراج الاخبار' کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے جس کا اجراء 1841 میں ہوا تھا۔ ہر چند کہ یہ فارسی زبان میں شائع ہوتا تھا لیکن بیشتر مؤرخین نے پہلی جنگ آزادی میں اردو اخبارات کے ضمن میں اس کے حوالے دیئے ہیں۔ جنگ آزادی 1857 سے کچھ سال قبل اس اخبار کے آخری دو تین صفحوں پر اردو کی خبریں 'دہلی اردو اخبار' اور 'صادق الاخبار' کے عنوان سے شائع ہوتی تھیں لیکن جنگ شروع ہوتے ہی اردو حصہ ختم کر دیا گیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ فارسی زبان وادب نے ہندوستانی تہذیب اور ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ فارسی زبان وتہذیب سے متاثر رہی ہے۔ فارسی زبان و ادب کے فروغ میں ہندوستان کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ دنیا میں فارسی زبان کا پہلا اخبار 1822 میں ہندوستان سے شائع ہوا جس کا نام 'مراۃ الاخبار' تھا۔

'سراج الاخبار' کی اہمیت کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ اس کی اشاعت آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کے ایماء پر ہوئی تھی اور یہ اخبار بنیادی طور پر مغلیہ دربار کا روزنامچہ (سرکاری گزٹ) تھا۔ اس میں بادشاہ کے روزانہ کے معمولات کے تذکرے کے علاوہ ملکی غیر ملکی اور مقامی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ محمد عتیق صدیقی نے 'سراج الاخبار' کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"سراج الاخبار' دہلی کا ہفتہ وار فارسی اخبار تھا جس کا اجراء 1841 میں

ہوا تھا لیکن اس کی نوعیت، اس اعتبار سے اوراخباروں سے کچھ مختلف تھی کہ یہ بہادر شاہ ظفر، آخری تاجدار مغلیہ کے دربار کا روزنامچہ یا سرکاری گزٹ تھا۔ ضخامت آٹھ صفحات ہوتی تھی۔ اخبار کے ابتدائی حصہ میں بادشاہ کے روزانہ کے معمولات کا اجمالی ذکر تاریخ وار کیا جاتا تھا۔ یہ روزنامچہ پانچ ساڑھے پانچ صفحے کا ہوتا تھا۔ باقی ڈھائی تین صفحوں میں ملکی، غیر ملکی اور مقامی خبریں درج کی جاتی تھیں۔''(1)

ج۔ نٹراجن نے اس اخبار کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''سراج الاخبار بادشاہ کا اخبار ہے، جو شاہی محل سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے سارے کارکن شاہی ملازمین ہیں۔ یہ ہفتے میں ایک بار اتوار کو شائع ہوتا ہے۔ اس کی صرف 34 کاپیاں چھپتی ہیں جو متوسلین شاہی میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ گورنر جنرل، لفٹنٹ گورنر اور قلعے کے گارڈ کمانڈر کو بھی اس کی ایک ایک کاپی بھیجی جاتی ہے۔ ان سب کے علاوہ جن لوگوں کو یہ اخبار دیا جاتا ہے، ان کی تنخواہ سے ایک روپیہ ماہوار اخبار کے اخراجات پورے کرنے کے لئے وضع کیا جاتا ہے۔

'سراج الاخبار' کی زبان فصیح و بلیغ ہوتی ہے عموماً شاہی محل کی خبروں، اور خصوصاً بادشاہ کے سونے، کھانے، پینے، جانے، آنے اور اسی طرح کے دوسرے معمولات کی خبروں کے علاوہ اس اخبار میں اور کچھ نہیں ہوتا۔ محل کے باہر شاید ہی کوئی شخص اس کے نام سے واقف ہوگا۔''(2)

'سراج الاخبار' کے نگراں مصلح الدین سید ابوالقاسم تھے، جو دہلی کے آخری وقائع نگار شاہی تھے۔ اس اخبار کی ادارت کے فرائض سید اولاد علی کے سپرد تھے اور اس کی اشاعت امداد علی بیگ کے زیر اہتمام مطبع سلطانی میں ہوا کرتی تھی۔

بادشاہ سلامت کے روزنامچے کی اشاعت کی روایت کی داغ بیل مغل عہد کے ابتدائی برسوں میں ہی پڑی تھی، جسے اکبر نے خاص طور پر ترقی دی تھی۔

پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی نے 'سراج الاخبار' کے بعض فائل دیکھنے کے بعد اس رائے کا اظہار کیا کہ "فارسی بہت پختہ اور ٹھیٹھ منشیانہ ہوتی تھی۔ لفاظی، جو دربار کی شان تھی، اس کے علاوہ اسلوب فصیح اور عبارت بلیغ ہوتی تھی۔ زبان کے قاعدے اور آئین کی پابندی سخت تھی۔"

اخبار میں بہادر شاہ ظفر، استاذ ذوقؔ اور مرزا غالبؔ کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کی زندگی کے دو دور ہیں۔ پہلے دور میں یہ قلمی اخبار تھا، اس لئے گارساں دتاسی نے اسے دہلی کا سب سے پرانا اخبار قرار دیا ہے۔ دوسرے دور یعنی 1841 میں اس نے قلمی اخبار سے مطبوعہ اخبار کی حیثیت اختیار کر لی۔ اخبار کا سائز 12×18 انچ تھا اور یہ آٹھ صفحوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر صفحے پر دو کالم اور ایک کالم میں 25 سطریں ہوتی تھیں۔

دہلی سے شائع ہونے والے ایک قلمی اخبار کے مدیر چونی نے مقدمہ بہادر شاہ ظفر کے دوران فوجی عدالت کو بتایا کہ بادشاہ کے حکم سے قلع معلیٰ میں واقع چھاپہ خانے میں 'سراج الاخبار' کے نام سے فارسی زبان میں کورٹ گزٹ بھی نکلتا تھا۔ انقلاب سے پہلے اس میں صرف قلعہ معلیٰ کی خبریں دی جاتیں لیکن کبھی کبھی دوسری اطلاعات بھی چھپ جاتی تھیں۔

'سراج الاخبار' نے اپنے 11 مئی 1857 کے شمارے میں بغاوت کی جو رپورٹنگ کی ہے اس کا اردو ترجمہ اس طرح ہے:

> "علی الصبح جب بادشاہ ہند نے خدائے عادل کے حضور میں دعا کی (اس کے بعد) خبر پہنچی کی انگریزوں کے ماتحت میرٹھ کے سوار اور پیادے اپنے حکام کی حکم عدولی کر کے اور اپنے افسران کو قتل کے گھاٹ اتارنے کے بعد جوق در جوق جھروکہ کے پاس جمع ہو کر اس کے دروازے کھولنے کے لئے آواز دے رہے ہیں۔
>
> انہوں نے تمام دروازے، قلعوں اور دفتروں کے دروازے کھول دیئے اور شہر پناہ کا دروازہ بھی کھول دیا اور ملخ کی صورت داخل ہو گئے اور مکینوں کو تہ تیغ اور مکانوں کو غارت کر دیا، بلکہ تمام انگریزوں کو موت کے

گھاٹ اتار دیا اور ان کے مکانوں کو نذر آتش کر دیا۔
دوپہر کے قریب کئی گروہ بادشاہ کے حضور میں اس درخواست کے ساتھ حاضر ہوئے کہ وہ شہر کے انتظام کی خاطر افسران کو مقرر فرمائیں تا کہ ان کے توسط سے شہر کا انتظام بحسن وخوبی انجام پائے۔
آخر کار مرزا بخت بہادر اور مرزا عبداللہ جیسے فرزندان ذیشان کو افسر کے طور پر مقرر کیا گیا تا کہ شہر میں امن وآشتی قائم ہو۔"(3)

حوالے

1۔ محمد عتیق صدیقی: 'اٹھارہ سو ستاون اخبار اور دستاویزیں'، صفحہ: 257

2۔ J. Natrajan : History of Indian Journalism, Page: 58

3۔ 'سراج الاخبار'، 11 مئی 1857

کوہِ نور

جنگ آزادی 1857 میں اردو صحافت نے جو سر فروشانہ کردار ادا کیا ہے، وہ تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھنے کے قابل ہے لیکن اسی دور میں اردو کا ایک ایسا اخبار بھی تھا جو مجاہدین آزادی اور عظیم محب وطن لوگوں کو 'نمک حرام'، 'مفسد' اور 'غدار' کے لفظوں سے پکارتا تھا۔

ہر چند کہ اردو صحافت کے ارتقاء میں 'کوہِ نور' کا ایک بڑا تاریخی کردار بھی ہے جو اس نے نصف صدی سے زیادہ کی اپنی عمر کے دوران ادا کیا لیکن جنگ آزادی 1857 میں 'کوہِ نور' نے انگریز پرستی اور مجاہد شکنی کی جو روش اختیار کی تھی وہ دراصل اس کی اشاعت کا مطمح نظر بھی تھا کیونکہ اسے سامراجی طاقتوں کی کھلی سرپرستی حاصل تھی۔

20 ستمبر 1857 کو جب انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو 21 ستمبر کو 'فتح دہلی' کی نوید لوگوں تک پہنچانے کے لئے 'کوہِ نور' نے خصوصی ضمیمہ کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ جس سے اس کی انگریز پرستی اور مجاہدین کی مخالفت عیاں ہوتی ہے:

'مژدہ فتح دہلی'

"صاحب ایجوٹنٹ (ایڈ جوٹنٹ) جنرل فوج ظفر موج دہلی نے کل کی تاریخ 9 بجے صبح بذریعہ تار برقی اول مرتبہ یہ تحریر فرمایا کہ مورچہ بری پر دلیران انگریزی نے کل شام کو حملہ کر کے چھ توپ اور ایک بم بلا کسی نقصان کے بغیر اپنے قبضے میں

کر لیں اور آج صبح لاہوری دروازہ بھی قبضہ میں آ گیا۔ اجمیری دروازہ اور مور چال بیرونی سے اب گولہ نہیں چلتا۔ مفسدین ان جملہ مقامات کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ آمد و رفت ہماری آج چاندنی چوک میں جاری ہو جائے گی۔ شاہ دہلی اور اس کے خاندان کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

پھر دس بجے صبح کے صاحب موصوف نے یہ خبر بھیجی کی اجمیری دروازہ اور دیگر مور چال پر سرکاری قبضہ ہو گیا۔ دو پہر کو لال محل (لال قلعہ) جامع مسجد اور اجمیری دروازے پر سرکاری تسلط ہو گیا۔ پھر پانچ بجے شام کو یہ خوش خبری آئی کہ معرکہ دہلی تمام ہوا۔ سنا جاتا ہے کہ شاہِ دہلی مع عیال و اطفال کے ایک گاؤں میں جو شہر سے قطب صاحب کی سمت چار میل کے فاصلے پر ہے، چلے گئے ہیں۔'' (1)

اس خبر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ 'کوہِ نور' کو اس بات پر کس درجہ خوشی ہوئی کہ انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ حاصل کر لیا ہے۔ اس نے اس خبر میں معرکہ دہلی کے اس صورتحال میں تمام ہونے کو خوش خبری سے تعبیر کیا ہے اور انگریزوں کی دلیری کو فخریہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں 1857 کے انقلاب سے متعلق اپنی تمام خبروں میں 'کوہِ نور' نے مجاہدین کو مفسد، نمک حرام اور سرکش جیسے الفاظ سے مخاطب کیا ہے اور ظالم انگریز فوج کے سپاہیوں کو 'دلیران' اور 'شجاعان' کے لقب سے نوازا ہے۔ 9 فروری 1857 کی اشاعت میں لکھنؤ پر ظلم وستم ڈھائے جانے کے منصوبے سے متعلق ایک خبر سے انگریزوں کی شقاوت اور انتقامی پالیسی کا خلاصہ ہوتا ہے:

''صاحب ہرکارہ از روئے تحریر ایک صاحب معتبر لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ سے قطعی حکم آ گیا ہے کہ شہر لکھنؤ غارت کیا جائے اور تمام محلات اور مکانات شاہی معہ دیگر عمارات، کیا امیر کیا غریب مسمار کئے جائیں۔ المختصر وہ ایسا برباد کر دیا جاوے کہ اینٹ پر اینٹ نہ رہنے پاوے اور پتہ و نشان آبادی کا معلوم نہ ہو۔'' (2)

'کوہِ نور' لاہور محض انگریزوں کی حمایت اور مجاہدین کی حوصلہ شکنی کی سرکاری پالیسی پر ہی عمل پیرا نہیں تھا بلکہ اس کے کچھ نامہ نگار جاسوسی کے فرائض بھی انجام دے رہے

تھے۔ 'کوہِ نور' کی ایک خبر سے انکشاف ہوتا ہے کہ اس کا بریلی کا نامہ نگار انگریز حکام کے براہ راست رابطہ میں تھا۔

''صاحب خبر لکھتے ہیں کہ 7 تاریخ کو میں خان بہادر خاں کے گھر پر گیا جہاں جمع ہونا سرکشوں کا سنا تھا پھر وہاں پہنچ کر میں نے کوئی مفسد نہ پایا اور صرف 5 یا 6 توپیں خورد و کلاں اور کچھ بارود پڑی ملی۔ میں نے اسی وقت ایک سوار کو خدمت میں صاحب کمشنر کے رپورٹ کرنے کو بھیجا۔ صاحب کمشنر بہادر سوار کو راستے میں ملے اور سوار نے جو دیکھا سب گذارش خدمت صاحب ممدوح کر دیا اور صاحب ممدوح نے بہت جلد خان بہادر خاں کے گھر پہنچ کر گارڈ سپاہان گواہ متعین فرمایا۔ افواہ ہے کہ سرداران مفسدان اور خان بہادر خاں وسو بہارام پیپل پور ضلع شاہجہاں کو بھاگ گئے ہیں۔ کوئی مفسد یا مسلمان شہر بریلی میں موجود نہیں۔''

'کوہِ نور' کی اس انگریز پرست پالیسی کے سبب اسے دن دونی رات چوگنی ترقی حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے یہ ہفتہ وار کی صورت میں جاری ہوا پھر جلد ہی ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا اور پھر اس کی اشاعت ہفتہ میں تین بار ہونے لگی۔ اتنا ہی نہیں اس کی تعداد اشاعت بھی تمام اخبارات سے آگے نکل گئی۔ ہر چند کہ 'کوہِ نور' انگریزوں کی سرپرستی میں جاری ہوا تھا لیکن اس کے باوجود 22 مئی 1857 سے اس پر سنسر بٹھا دیا گیا تھا اور اس میں شائع ہونے والے مضامین کو سنسر کرنے کی ذمہ داری اسسٹنٹ کمشنر پرکنز کو سونپی گئی تھی۔ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد 'کوہِ نور' پر سنسر بٹھانے کا واحد مقصد اس کی خبروں پر مکمل کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ کیونکہ اس کے بانی منشی ہرسکھ رائے ازالہ حیثیت عرفی کے ایک معاملہ میں قید کی سزا بھگت رہے تھے۔

'کوہِ نور' غیر منقسم پنجاب کا پہلا اردو اخبار تھا۔ ملکیت ہرسکھ رائے کی تھی اور اس کے مہتمم لالہ جگت نرائن اور پرنٹر منشی نتھو رام آنند تھے۔ اخبار کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اردو اخبارات کی اولین سوانح عمری 'اختر شہنشاہی' (مطبوعہ 1880) میں اس کا ایک مکمل صفحہ کا اشتہار شائع ہوا ہے جس میں لکھا ہے کہ:

''اخبار کوہِ نور، لاہور ہفتہ میں تین بار شائع ہوتا ہے۔ ضخامت 16 صفحات۔ بلاوصول قیمت پیشگی عموماً کسی نئے قدردان کے نام جاری نہیں ہوتا۔ نئے معاونین درخواست کے ہمراہ پیشگی رقم لطف فرمادیں۔ایک ماہ سے کم کے لئے کسی کے لئے جاری نہیں ہوگا۔''(3)

سرکاری دستاویز میں شائع اعلانیہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اخبار اعلانیہ سرکار کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا اور اس نے اپنی اس وابستگی کو چھپانے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔خبروں کے علاوہ آگرہ گورنمنٹ کے گزٹ کے اقتباسات بھی اس میں شائع کئے جاتے تھے۔

جنوری 1850 کے اسعد الاخبار (آگرہ) میں شائع شدہ ایک خبر سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اجراء 14 جنوری 1850 کو ہفتہ وار اخبار کی حیثیت سے ہوا تھا اور لالہ سکھ رائے 'کوہِ نور' کے اجراء سے پہلے 'جام جمشید' (میرٹھ) کے مہتمم تھے۔ لالہ سکھ رائے کا اصل وطن سکندر آباد (یوپی) تھا اور وہ اس اخبار کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے ہی خاص طور پر لاہور منتقل ہوئے تھے۔'اسعد الاخبار' کی خبر ملاحظہ ہو:

''اخبار نویسوں کے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ جنوری سنہ حال (1850) کی چودھویں تاریخ سے لاہور میں ایک اخبار موسوم بہ 'کوہِ نور' منشی ہرسکھ رائے کے اہتمام سے جو پیش تر 'جام جمشید' کے مہتمم تھے، جاری ہوا ہے۔ ازآں جا کہ پنجاب اور کشمیر اور کابل کی خبروں کے لوگ شائق رہتے ہیں۔اب اس اخبار کے ذریعہ سے وہاں کے حالات سارے اخبار نویسوں کو بے دقت دریافت ہو جایا کریں گے اور اخبار انگریزی سے ترجمہ نہ کرنا پڑے گا۔یہ اخبار مہینے میں چار بار چھپا کرے گا۔اس کی قیمت اٹھارہ روپے سالانہ اور بہ رسم اڈوانس بارہ روپے سالانہ مقرر ہوئی اور چھ ورق کا اخبار ہوگا۔''(4)

1853 کے ایک اور سرکاری ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ 'کوہِ نور' کس طرح سرکاری سرپرستی کا اعلانیہ پیروکار تھا۔ اڈیٹر کی فراہم کردہ اطلاع کے بموجب سرکاری

ریکارڈ میں درج ہے کہ:

''گورنمنٹ کے بتلائے ہوئے اصولوں پر کوہِ نور مرتب کیا جاتا ہے اور لوگوں میں روشن خیالی پیدا کرنے اور ان کی ترقی و بہبودی میں ممد ہو رہا ہے۔ اب اس کی اشاعت 205 سے 259 ہو گئی۔ مطبع اور اخبار دونوں ہر سکھ رائے ہی چلا رہے ہیں۔''(5)

واضح رہے کہ 1854 میں اس اخبار کی اشاعت 249 تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے قارئین میں ہندو (162)، مسلمان (121) اور عیسائی (40) کے علاوہ اخبار کی 26 کاپیاں تبادلہ میں بھیجی جاتی تھیں۔ جنوری 1853 سے 'کوہِ نور' پھر ہفتہ وار ہو گیا تھا۔ اردو صحافت کی ترویج و اشاعت اور صحافیوں کی تربیت کے ضمن میں 'کوہِ نور' نے جو خدمات انجام دیں، اس کے حوالے سے نادم سیتاپوری کا یہ بیان قابل توجہ ہے:

''پنجاب کی اردو صحافت میں 'کوہِ نور' لاہور کو نہ محض اولیت کا شرف حاصل تھا بلکہ اس اخبار کے اجراء سے شمالی ہند میں صحافت کا وہ پہلا اسکول قائم ہو گیا جس نے غیر منقسم ہندوستان میں بڑے بڑے اخبار نویسوں اور صحافیوں کو جنم دیا تھا۔ منشی نول کشور، نادر علی شاہ، مولوی سیف الحق ادیب (تلمیذ غالب) مرزا موحد، منشی نثار علی شہرت، منشی محرم علی چشتی، منشی محمد الدین فوق اور نہ جانے کتنے چوٹی کے اخبار نویس اسی مکتب صحافت کے تربیت یافتہ تھے جو گزشتہ صدی میں ہندوستان کے 'افق صحافت' پر مہر و ماہ بن کر چمکے۔''(6)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'کوہِ نور' اپنے دور کا سب سے بڑا عہد ساز بھی تھا اور اس نے اردو صحافیوں کی ایک پوری نسل کی تربیت کا فریضہ انجام دیا۔ اپنے 55 سالہ دور میں اس اخبار نے مسلسل ترقی کی منزلیں طے کیں اور یہ صحافیوں کا مکتب بن گیا۔

گارساں دتاسی نے اپنی فرانسیسی تصنیف میں بتایا ہے کہ 'کوہِ نور' کا پہلا مدیر سورج بھان تھا جس نے کئی انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ 1857 کے بعد سورج بھان نے 'گنج شائیگاں' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ بھی جاری کیا۔ دتاسی نے ایک مقام پر

غلام محمد پرنبی اور منشی جمنا پرشاد کو بھی 'کوہِ نور' کا اڈیٹر لکھا ہے۔ اردو صحافت کے بعض محققین نے منشی نول کشور کی 'کوہِ نور' سے وابستگی کی بات بھی لکھی ہے۔ اس بارے میں عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں کہ:

''اردو صحافت کے بعض محققین کا بیان ہے کہ منشی نول کشور بھی ادارہ 'کوہِ نور' سے وابستہ رہے۔ وہ انقلاب کے بعد آئے ہوں تو الگ بات ہے ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انقلاب سے قبل وہ 'کوہِ نور' سے منسلک نہیں تھے۔ بہر حال وہ بہت اثر ورسوخ کے مالک تھے اور جب 1857 میں 'کوہِ نور' سیالکوٹ کے اخبار 'چشمہ فیض' میں کش مکش نے بدنما صورت اختیار کر لی تو منشی نول کشور نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور 3 جون 1857 کے 'کوہِ نور' میں صلح کا اعلان ہو گیا۔ اس وقت منشی نول کشور 'سفیر آگرہ' کے مدیر تھے۔ (7)

'کوہِ نور' کے مالک منشی ہر سکھ رائے نے 1849 میں مطبع 'کوہِ نور' کے نام سے لاہور میں ایک پریس قائم کیا اور پھر اسی نام سے اخبار کا اجراء عمل میں آیا۔ 'اختر شہنشاہی' کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوہِ نور کے پہلے مہتمم لالہ جگت نرائن تھے اور غالباً ذاتی طور پر منشی ہر سکھ رائے اس کی ادارتی ذمہ داریوں سے براہِ راست کبھی متعلق نہیں رہے۔ اس اخبار نے انہیں نہ صرف دیسی ریاستوں سے قربت عطا کی تھی بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمہ داروں میں انہیں خاصا رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ 'کوہِ نور' کی پالیسی اس دور کے صحافتی معیار سے مطابقت رکھتی تھی۔ اس لئے اس پر اکثر ذاتیات اور ابتذال کا رنگ چھایا رہتا تھا۔

'کوہِ نور' کے ساتھ اس کے ایک ہم عصر اخبار 'چشمہ فیض' کی نوک جھونک اور معاصرانہ چشمک کا اندازہ اس میں شائع ہونے والی بعض خبروں کو پڑھ کر بخوبی ہوتا ہے۔ اس میں ایک خبر (مطبوعہ 18 اپریل 1854) تو اتنی بے مزہ ہے کہ اس کو نقل کرنا بھی صحافتی اخلاقیات کے خلاف ہے۔ البتہ اسی سلسلے کی ایک دیگر خبر پڑھ کر 'کوہِ نور' کی مبتذل اخبار نویسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

”دیکھئے مہتمم ’کوہِ نور‘ نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ جو چند اخبار نویس اوس کے حق میں نیش عقرب ہو رہے ہیں۔ مہتمم صاحب ’ریاض نور‘ نے بنا نقیص مطبع دریائے نور سے جو تھوڑے ہی عرصہ میں خشک ہو گیا ...... شامت اعمال اپنے سے سیالکوٹ سے بہہ کر ملتان میں جا نکلے اور بغض و کینہ ان کا وہاں بھی بدستور آب و تاب پر رہا۔ آخر کار گالم گلوچ تک نوبت پہنچی کہ پسر مہتمم کوہِ نور نے یہ سمجھ کر (کہ) گندگی میں پتھر پھینکنا اور شرافت کو دھبہ لگانا محض واہیات ہے...... مگر جب نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ یہ حیضی بچہ ’چشمہ فیض‘ نام پیدا ہوا تو اُس نے بقول پدر ترا باشد پسر توں بود، ان کے ہی قدم پر قدم رکھا۔“(8)

معاصرانہ چشمک کے اس ذاتی تنازعہ کے علاوہ یوں بھی کوہِ نور کا انداز تحریر اپنے سر پرستوں کے حق میں اور مجاہدین کے خلاف تیر ونشتر کی طرح تھا اور اس رو میں بالکل ذاتی اور قطعی خانگی نوعیت کی خبروں کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا تھا۔ ذیل کی خبر کا تعلق بادشاہ اودھ کی ذات سے ہے اور اس کا طرز تحریر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس پالیسی کی بھی عکاسی کرتا ہے جو وہ اودھ کے ذیل میں اپنانا چاہتی تھی۔

’خبر لکھنو‘

”حضرت جہاں پناہ کی شادی دختر وزیر سے ہوئی اور جلسہ دعوت کا چند روز بڑا عظیم ہوا۔ اگر چہ ابتداء میں وزیر اپنی لڑکی کی شادی کرنے سے ناراض تھا مگر اب خوش ہے کیونکہ اس کے اختیارات اور زیادہ ہو گئے اور چوں کہ اور بھی لڑکیاں اس کی ہیں (اس لئے) یقین ہے کہ ولی عہد کو بھی (وہ) اپنا داماد بنائے۔ یہ عروس جدید پہلے کسی اور سے منکوح تھی۔ مگر حضرت نے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور وزیر سے فرمایا کہ اگر تمہاری لڑکی بھی کام نہ آئے تو تمہاری وزارت سے کیا حاصل۔“(9)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ 1857 کے بعد جب انگریزوں نے اپنے مخالفین اور مجاہدین آزادی کے خلاف کارروائی شروع کی تو اس دوران بھی ’کوہِ نور‘ کی خبروں کا

انداز مجاہدین اور والیان ریاست کے خلاف ہی رہا۔ مثال کے طور پر خان بہادر خاں کے مقدمہ کا فیصلہ مارچ 1860 میں ہو گیا تھا جس میں انہیں پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ 10 مارچ 1860 کی اشاعت میں 'کوہِ نور' نے اس مقدمہ میں خان بہادر خاں کا مکمل تحریری بیان شائع کرنے سے قبل جو تمہید شائع کی ہے اس میں انہیں مفسد اور نمک حرام جیسے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ناظرین اخبار کو یاد ہے کہ بریلی 'خان بہادر خاں' باغی کے مقدمے کی تحقیقات کے واسطے ایک کمیشن صاحبان انگریز بہادر مقرر ہوئے تھے اور سرکار کی طرف سے مقدمہ مفسد مذکورہ میں مسٹر مورس صاحب بہادر مدعی نامزد ہوئے تھے۔ سو حال طے ہو جانے مقدمہ کا اور صدور حکم پھانسی نسبت نمک حرام مذکورہ درج اخبار گذشتہ ہو چکا ہے۔''

'کوہ نور' کے بانی منشی ہر سکھ رائے ضلع بلند شہر کے قصبہ سکندر آباد (اتر پردیش) کے ایک علمی روایات کے حامل کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ 1816 میں پیدا ہوئے۔ اردو اور فارسی ادب کی تعلیم پائی اور 34 سال کی عمر میں لاہور آکر صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ منشی ہر سکھ رائے کی لاہور آمد کے بارے میں گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ مطبع کوہِ نور پنجاب بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کی سرپرستی میں قائم ہوا جو حکومت پنجاب کا دوسرا نام تھا اور کوہِ نور سرکار انگریز کے اہتمام اور سرپرستی میں جاری ہوا۔(10)

عبدالسلام خورشید نے 'کوہِ نور' کے اجراء کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ:

''سرکار انگریزی یہ نہیں چاہتی تھی کہ اردو صحافت کے آغاز میں کوئی ایسا شخص پہل کرے جس کی وفاداری مشکوک ہو۔ چنانچہ اس نے ایک ایسے شخص کی سرپرستی قبول کی جس کی وفاداری پر اسے یقین تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں 'کوہِ نور' حکومت کا محبوب رہا اور اس کے خریداروں میں بڑے بڑے انگریز افسر شامل تھے۔''(11)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اچانک مارچ 1857 میں منشی ہر سکھ رائے کی گرفتاری عمل میں آئی اور انہیں تین سال کی قید ہوئی۔ ہر سکھ رائے کی گرفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالسلام خورشید رقمطراز ہیں کہ:

"مارچ 1857 تک اخبار باقاعدگی سے چلتا رہا اوراس کی زندگی پرسکون رہی۔ اچانک منشی ہر سکھ رائے گرفتار ہوئے اور انہیں تین سال قید کی سزا ملی، جرم کی نوعیت ہمیں معلوم نہیں۔لیکن غالباً ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ تھا۔بہر حال اخبار جاری رہا اوراس کا اہتمام منشی ہیرالال کے سپرد ہوگیا۔اس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ 1857 کے انقلاب کے دوران میں منشی ہر سکھ رائے پس دیوار زنداں رہے لیکن ان کا اخبار سخت جان تھا۔ براعظم کے بے شمار اردو اور فارسی اخبار انقلاب کے دوران میں بند ہو گئے۔لیکن کوہِ نور جاری رہا۔" (12)

جیل سے رہائی کے بعد منشی ہر سکھ رائے کی حیثیت اور وقعت میں خاصا اضافہ ہوا اور ان پر حکومت کی نوازشیں بڑھ گئیں۔اس سلسلے میں عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد منشی ہر سکھ رائے کا وقار بحال ہو گیا۔ دولت ان کے گھر کی لونڈی تھی۔'ہر سکھ رائے حویلی'،اس کا ایک ثبوت تھی۔ راجہ اور نواب انہیں مدعو کرتے تھے اور مہاراجہ کشمیر تو خاص طور پر مہربان تھا۔ پھر میونسپل کمیٹی کے ممبر بنے اور ان کا نام لاہور کے پچاس رؤسا میں شامل ہوا۔

2 ستمبر 1890 کو منشی ہر سکھ رائے کی وفات ہوئی تو ان کے متبنیٰ منشی جگت نارائن نے کاروبار سنبھال لیا۔ کچھ عرصے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔اس کے بعد منشی ہر سکھ رائے کی بیوہ نے 'کوہِ نور' کو ہفت روزہ کے طور پر جاری رکھا اور جب محسوس کیا کہ اس اخبار کی مانگ نہیں رہی تو 1904 میں اسے بند کر دیا گیا۔

حوالے

1۔ 'کوہِ نور' ضمیمہ 21 ستمبر 1857
2۔ 'کوہِ نور' 9 فروری 1858ء
3۔ ضمیمہ 'اختر شاہنشاہی'
4۔ 'اسعد الاخبار' آگرہ، جنوری 1850
5۔ محمد عتیق صدیقی: 'صوبہ شمال و مغربی کے اخبارات و مطبوعات'، صفحہ: 127
6۔ نادم سیتاپوری: 'پنجاب کا پہلا اردو اخبار' مطبوعہ 'العلم' کراچی اکتوبر تا دسمبر 1971
7۔ 'صحافت پاکستان و ہند میں'، صفحہ: 114
8۔ 'کوہِ نور' 3 جون 1854ء
9۔ 'کوہِ نور'، یکم جولائی 1851ء
10۔ دتاسی: 'ہندوستانی ادب کی تاریخ'
11۔ 'صحافت' پاکستان و ہند میں'، صفحہ: 113
12۔ ایضاً، صفحہ: 113

'طلسم' لکھنؤ

لکھنؤ سے شائع ہونے والے اس دور کے اخبارات میں 'طلسم' کا ذکر بار بار آتا ہے جو کہ اپنی ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے بھی ایک دیدہ زیب اخبار تھا۔ اس پرآشوب دور میں جب کہ بیشتر اخبارات کا حلیہ بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے 'طلسم' نے اپنا سرورق بڑا منقش اور دیدہ زیب بنایا ہے۔ نستعلیق خط میں تیار کی گئی اس کی لوح خاصی متاثر کن ہے۔

'طلسم' 25 جولائی 1856 کو مولوی محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی نے جاری کیا جو انگریز حکومت پر نکتہ چینی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ 'طلسم' میں قلعہ معلیٰ کی خبریں بھی برابر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ بہادر شاہ ظفر کے خلاف جب انگریزوں نے مقدمہ چلایا تو 'طلسم' کا 16 دسمبر 1856 کا شمارہ مبینہ بغاوت 1857 کے معاملہ میں بطور ثبوت پیش کیا گیا۔ یہ شمارہ نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں بغاوت کے کاغذات میں محفوظ ہے۔

جنوری 1857 کے 'طلسم' کے ایک شمارے کی خبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں انگریزوں کا تسلط قائم ہونے کے بعد کس قسم کی طوائف الملوکی پھیلی۔ اس وقت اودھ کی سلطنت کے خاتمہ کو دس ماہ گذرے تھے اور وہاں کمپنی بہادر کی باضابطہ حکومت قائم ہو چکی تھی۔ 'طلسم' لکھنؤ کی خبر ملاحظہ ہو جس کا عنوان ہے:

'لکھنؤ'

''لکھنؤ میں سنیچر آیا ہے۔ چوروں نے ہنگامہ مچایا ہے۔ جو سانحہ ہے عجائب

ہے، آنکھ جھپکی پگڑی غائب ہے۔

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھام لو دستار

''جس دن سے (واجد علی شاہ کی) سلطنت نہ رہی۔ شہر بگڑا چوروں کی بن آئی، اس اندھیر پر ایک مثل یاد آئی کہ اندھے کی جورو کا خدا رکھوالا ہے۔ اس شہر میں اندھا دھندی ہے۔ اس نابینائی پر یہ حکومت اندھیر ہے۔ صاف اندھے کے ہاتھ میں بٹیر ہے۔ روزانہ باتیں عجائب ہوتی ہیں۔ سوجھتا تو خاک نہیں، ٹٹول ٹٹول کر چٹھیاں غائب ہوتی ہیں۔''

'طلسم' لکھنؤ کی اس خبر کا انداز اور زبان و بیان افسانوی طرز کا ہے کہ یہی اس دور میں مقبول عام زبان تھی۔ بعض باتیں اشاروں اور کنایوں میں کہنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً 'ٹٹول ٹٹول کر چٹھیاں غائب ہوتی ہیں' سے مراد یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے ذاتی خطوط بھی سنسر ہوتے تھے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کو مکمل تسلط حاصل ہو جانے کے بعد بھی اپنی حکومت کے خلاف عوام الناس کے غم و غصہ اور ناراضگی کا احساس تھا اور وہ انفرادی جاسوسی بھی کرتے تھے۔

اس شمارے میں 'راجپوتانہ' کے عنوان سے ایک خبر ہے جس میں آنے والے طوفان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ خبر کے الفاظ چونکا دینے والے ہیں اور یہ خبر اپنے متن کے اعتبار سے بھی خاصی اہمیت کی حامل ہے:

''اخبار انگلش مین مطبوعہ 12 دسمبر 1856 سے معلوم ہوا کہ اطاعت کا قرینہ زمانے سے معدوم ہوا۔ ان دنوں جتنے راجہ ہیں، سب نے بالاتفاق چٹھی اس مضمون کی تحریر کی ہے۔ جرأت کی تقریر کی ہے کہ جو سرکاری کمپنی کے خلاف عہود و مواثیق رؤسا سے ہندوستان کی ریاست بجبر لیتی ہے۔(اس سے) ایک تو خلقت بیکاری سے مرتی ہے۔ دوسرے بسی بسائی بستیاں سرکار ویران کیے دیتی ہے۔ اس باعث سے ہم

لوگوں نے باہم ہر ایک کو فساد پر آمادہ کیا ہے۔ ہمارا ملک اگر لیں گے تو
جان دینے کا ارادہ کیا ہے۔ خلاف عہد و پیماں اگر ریاست لینے پر سرکار کو
اصرار ہے تو یہاں بھی سرِ میدان ہر ایک جان دینے کو تیار ہے۔ جس دم
معرکہ کارزار کی گرم بازاری ہوگی، دیکھ لینا کیسی ذلت و خواری ہوگی۔
پادشاہ اولوالعزم کو پاس تحریر اور خیال تقریر ضروری ہے۔ بدعہدی میں ہلڑ
مچے گا۔ ایک عالم مستعد فتور ہے۔ گویوں کی زباں بند رہتی ہے۔ راست
بازوں سے خلق خدا رضامند رہتی ہے۔" (1)

واضح رہے کہ 'طلسم' نے ضبطیٔ اودھ کے بعد سے ہی کمپنی حکومت کے خلاف بے باکی سے لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جنگ آزادی کے ہیرو مولوی احمد اللہ شاہ کی لکھنؤ میں جاری انقلابی سرگرمیوں کی ایک رپورٹ 'طلسم' نے شائع کی ہے۔ انہوں نے 1856 کے اواخر میں اپنی شعلہ بیانی سے عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس سلسلہ کی خبر 'طلسم' کے 13 فروری 1857 کے شمارے میں ملاحظہ ہو:

"وہ جو احمد اللہ گھسیاری منڈی میں مقیم ہیں جو چاہتے ہیں زبان بولتے
ہیں بے خوف و بیم ہیں۔ بہت بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ اگر مولوی امیر علی
صاحب مغفور کا ماجرا یاد کرتے ہیں۔ زبانی جد و جہد کرتے ہیں آخر جب
یہ خبر حکام کو پہنچی، طبیعت ان کی فکر انتقام کو پہنچی۔ 20 جنوری کو حسب الحکم
شہر کے کوتوال آئے۔ بعد فہمائش فرمایا کہ یہ بیان آپ کا بہت بے جا
ہے۔ نری خرابی کے ڈھنگ ہیں۔ شاہ صاحب نے لب کھولے تو بہ بانگ
بولے کہ تم بھی مسلمان ہو، اگر شرع کا دھیان ہو اور سامان و اسباب
ضرورت مہیا ہو۔ فرمایئے تم پر اس وقت جہاد فرض نہ ہو تو کیا ہو۔ اس
طرح میں بھی جہاد کو فرض جانتا ہوں، بے سامانی سے ناچار ہوں، اگر بہم
پہنچے تو تیار ہوں۔"

'طلسم' نے اپنی تحریروں سے جہاں ایک طرف اندرون ملک انگریزوں کے

خلاف پھیلنے والی بے چینی اور تحریک حریت کو بے باکی سے پیش کیا ہے، وہیں دوسری طرف انگریزوں کے خلاف چین اور ایران کی بڑھتی ہوئی طاقت کی مرعوب کن منظر کشی کی۔ جس کا مقصد ہندوستانیوں میں فرنگیوں کے خلاف خود اعتمادی کو فروغ دینا تھا۔ ایک خبر میں ممبئی کے انگریزی اخبار 'ٹیلی گراف' کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> "وہ لشکر شاہ ایران ہے۔ اس میں ایک ایک رستم اسفندیار ہے، مرد میدان کارزار ہے، جس دم وہ برق کردار زنہار اٹھاتے ہیں، فوج غنیم کے دل بادل کی ٹھن جاتے ہیں۔ معرکہ بزم میں جب ان کی باری آتی ہے فضا گھبراتی ہے، فوج انگریزی کو ان کے مقابلے کا حال کھلا نہیں کبھی ان سے معاملہ پڑا نہیں۔" (2)

حوالے

1۔ طلسم، لکھنؤ، جلد: 1، نمبر: 62، 16 جنوری سنہ 1857

2۔ کوہِ نور نمبر 32 جلد نمبر: 1، جنوری 1857

سحر سامری

'طلسم' لکھنؤ ہی کی طرح 'سحر سامری' بھی لکھنؤ کا ایک بے باک اور بے لاگ اخبار تھا اور اس نے بارک پور میں چربی والے کارتوسوں پر دیسی سپاہ کی بغاوت، ایرانی فوج کی پیش قدمی اور انگریزوں کے خلاف ملک میں چاروں طرف پھیلنے والی بے چینی اور شورش کی خبریں تواتر کے ساتھ شائع کیں۔

ہفتہ وار 'سحر سامری' 17 نومبر 1856 کو لکھنؤ سے جاری ہوا۔ اس اخبار کی زبان لکھنؤ کی مقفیٰ اور پسندیدہ زبان تھی۔ 15 دسمبر 1856 کے شمارے کی ایک خبر کا انداز ملاحظہ ہو جس کی زبان اور عبارت سے حالات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

> ''ان دنوں غلہ کی گرانی ہے۔ گرانی خاطر کی ارزانی ہے۔ اس قدر مہنگا اناج ہے۔ آسیائے فلک بھی دانے کو محتاج ہے۔ فاقہ کشوں کی برق آہ شرربار سے خرمن ماہ جل گیا۔ چور فاقہ سے افاقت نہیں، بے معاشی نے ہر قماش کے آدمی کا اطمینان کھودیا۔ جس نادان و دانا نے حال بربادی سنا رودیا۔ ایک تو معاش نہیں، جائے تلاش نہیں۔ دوسرے وفور غم سے گندمی رنگ ہر بشر نیلا ہوا، گویا مفلسی میں آٹا گیلا ہوا۔ حاکم اس طرف عنان توجہ پھیرتا نہیں۔ بس کیا کریں کہ اکیلا چنا بھاڑ پھوڑتا نہیں۔'' (1)

سحر سامری کے اڈیٹر گھیر نرائن عیاش اور پنڈت بیج ناتھ تھے۔ سحر سامری کی ایک ناقص فائل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ سحر سامری کی اشاعت بابتہ

20 اپریل 1857 کی ایک اور خبر اپنے انداز بیان اور مواد کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے جس کا تعلق لارڈ ڈلہوزی کی ذات سے ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اخبار موروده لندن سے مبرہن ہوا کہ لارڈ ڈلہوزی خیر خواہ ہند، ترقی طلب سرکار کمپنی انگریز بہادر مبتلائے رنج ومحن ہوا۔ یعنی پشت راہوار سے گر کر مانند تیمور لنگ ہوا۔ بے راہ چلنے سے دل تنگ ہوا۔ مہتمم 'گلشن نو بہار' فرماتے ہیں کہ شاید دودِ آہ دل درویشان ہند کا یہ اثر ہے۔ بمنزلہ زہر ہلاہل قند مکرر ہے لیکن زہے نصیب کہ زیادہ عروج پایا، یعنی ان دنوں وزیر مہمات کا عہدہ ہاتھ آیا۔ خدا معلوم ہے کہ آئندہ کیا مرتبہ حاصل ہو۔ پیغام دل آزاری ہے کہ لارڈ ڈلہوزی کو (ہندوستان کا گورنر جنرل بننے کی) ہوس دوبارہ ہوئی۔ یہ تجویز آشکارا ہوئی کہ خرمہرہ ہائے باقی ماندہ بنگالہ و ہند آ کے پھر چنے۔ ہر ایک مالدار و تونگر محتاج ہو کر اپنا اپنا سر دھنے اس حسن نیت سے ارباب پارلیمنٹ کے حضور میں سوال دیا اور انھوں نے نیک کرداری سمجھ کر منظور کیا۔ کس واسطے کہ ہندوستان میں ابھی دو چار ریاستیں باقی ہیں اور وہ اس شکار بازی میں نام ور مشاقی ہیں۔ جس وقت ان ریاستوں کا (لارڈ ڈلہوزی کو) خیال آتا ہے ان کے دل میں ضبط نہ ہونے سے ملال آتا ہے۔"

رسالہ بغاوت ہند

دہلی اور لکھنؤ کے بعد اردو صحافت کا بڑا مرکز آگرہ تھا جہاں سے کئی اہم اخبارات و جرائد شائع ہوئے اور انھوں نے جنگ آزادی میں اپنا کردار نبھایا۔ ان ہی میں ایک ماہنامہ جریدہ 'رسالہ بغاوت ہند' تھا جس کی اشاعت اگرچہ 1859 میں شروع ہوئی مگر اس کے ذریعہ ہمیں 1857 کے بعض اہم واقعات کی تفصیل ملتی ہے۔ 'رسالہ بغاوت ہند' کے مالک و اڈیٹر ڈاکٹر مکند لال تھے اور اس کی اشاعت منشی شیو نارائن آرام کے مطبع

مفید الخلائق میں ہوتی تھی۔

مشہور محقق مالک رام نے 'تلامذہ غالب' میں منشی شیونارائن آرام کی علمی سرگرمیوں کے ذیل میں ان کے مطبع مفید الخلائق کا ذکر کرتے ہوئے 'رسالہ بغاوت ہند' کا تذکرہ کیا ہے۔

''اسی مطبع سے 1858 میں ایک ماہوار پرچہ 'رسالہ بغاوت ہند' کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے اڈیٹر آرام کے دوست ڈاکٹر مکند لال تھے۔ اس میں 1857 کی تحریک کے حالات قسط وار چھپتے رہے۔''

'رسالہ بغاوت ہند' کی قیمت آٹھ آنہ ماہوار تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ آرام نے جب اس رسالہ کو جاری کرنے کا ارادہ کیا تو اس سے قبل ایک اشتہار بطور اعلان بھی شائع کیا اور مرزا غالب سے اس کے تاریخی نام کی درخواست بھی کی اور یہ بھی لکھا کہ وہ دہلی کے روٗسا میں اس کے خریدار پیدا کریں (اردو صحافت کی تاریخ، صفحہ:245) اس کے جواب میں مرزا غالب نے جو خط انھیں لکھا ہے اس سے اس وقت کی معاشی اور سیاسی صورت حال پر دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ غالب کا خط ملاحظہ ہو:

''برخوردار منشی شیونارائن کو دعا پہنچے۔ خط تمہارا مع اشتہار کے پہنچا۔ یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی نواب حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں، سوان کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں ہے، بہذا یہاں کی اقامت میں تذبذب خدا جانے کہاں جائیں کہاں رہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں نے 'آفتاب عالمتاب'[(2)] کی خریداری کر لی ہے۔ اب وہ مکرر حالات دربار شاہی کیوں لیں گے۔ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں۔ وہ لوگ اس طرف کیوں توجہ کریں گے۔ تم ادھر کا خیال دل سے دھوڈالو۔ رہا نام اس رسالہ کا تاریخی نام جانے دو۔ رستخیز ہند، غوغائے سپاہ، فتنہ محشر، ایسا کوئی نام رکھ لو۔''

غالب کے اس جوابی خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اس کے خریدار بنانے میں بوجوہ کوئی دلچسپی نہیں لی، اس کا تاریخی نام تجویز کرنے سے بھی

معذرت کر لی بلکہ جو نام تجویز کیے وہ بہت رواروی میں کیے گئے۔ اس لئے غالب کے تجویز کردہ ناموں میں سے کوئی نام اس رسالے کو نہیں دیا جا سکا۔

بزرگ صحافی جمنا داس اختر نے 'رسالہ بغاوت ہند کے ذیل میں کچھ روشنی ڈالی ہے تاہم انھوں نے اس کا سنہ اجراء 1859ء لکھا ہے۔ جمنا داس اختر لکھتے ہیں کہ:

''آگرہ میں جولائی 1859ء میں ڈاکٹر مکند لال نے 'تاریخ بغاوت ہند' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا۔ اگر اس رسالہ کے شماروں کی بنیاد پر ریسرچ کی جائے تو جنگ آزادی کی ایسی بہت سی تفاصیل کا علم ہوگا جو کسی کتاب میں شائع نہیں ہوئیں۔ اس رسالے کے مارچ 1860ء کے شمارے میں کانپور کی جنگ آزادی کے مفصل حالات درج ہیں۔ اس رسالہ میں جنگ آزادی کے لئے نانا صاحب کا تاریخی اعلان اشتہار کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ یہ اشتہار نانا صاحب کے حکم سے اردو اور ہندی میں مصطفےٰ خاں کے چھاپے خانے سے شائع ہوا تھا۔ رسالہ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس اشتہار کا مضمون یہ تھا کہ سب ہندوؤں اور مسلمانوں کو لازم ہے کہ اپنے اپنے مذہب پر کاربند رہتے ہوئے نوکری کے لئے آئیں۔''

اس وقت کانپور کو نانا صاحب نے آزاد کرا کے اپنی آزاد حکومت قائم کر دی تھی۔ وحید الدین کو نانا صاحب نے شہر کا کوتوال مقرر کیا۔ مولوی سلامت اللہ کے مکان کے نزدیک اسلامی جھنڈا لہرایا گیا۔ قاضی وسیع الدین کی رہنمائی میں ایک عظیم جلوس نکلا۔ عزیزن بھی مردانہ لباس میں گھوڑے پر سوار ہو کر جلوس میں شامل ہوئی۔ اس جنگ میں تعصب یا امتیاز نہیں تھا۔ ہندو مسلمان جو بہادری سے لڑتا اسے نانا صاحب عظیم افسر یا دوسرے افسر انعامات دیتے۔ مسلمانوں کے لئے شرعی عدالتیں قائم کی گئی تھیں۔ باغیوں کی ہائی کمان میں حسب ذیل مجاہد شامل تھے۔ بابا بھٹ، عظیم اللہ، احمد علی خاں، جنرل ٹیکا سنگھ، بریگیڈیئر جوالا پرشاد، مولانا لیاقت علی الہ آبادی۔'' (3)

عمدۃ الاخبار

'عمدۃ الاخبار' بریلی تو جنگ چھڑتے ہی روہیل کھنڈ کے انقلابی قائد خان بہادر خاں کا حامی ہو گیا تھا اور اس نے بھی اپنا نام تبدیل کر کے 'فتح الاخبار' کر دیا تھا۔ مجاہدین کی حمایت میں خبریں چھاپنے کے الزام میں اس کا پریس ضبط کر کے اخبار بند کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں 'عتیق صدیقی نے سرکاری رپورٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"فسادات شروع ہونے سے قبل بریلی سے صرف ایک اخبار 'عمدۃ الاخبار' کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ ہمارے افسروں کے شہر چھوڑنے کے بعد بھی اس کی اشاعت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا بلکہ باغی دربار کی سرپرستی میں 'فتح الاخبار' کا شاندار نام دے کر اس کو خان بہادر خاں کی حکومت کا سرکاری گزٹ بنا دیا گیا۔ شہر پر جب انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو مطبع کو ضبط کر کے اخبار بند کر دیا گیا۔ اس کی جگہ پر کرنے کے لئے کسی دوسرے اخبار کا اجراء نہیں ہوا۔" (4)

اس خبر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی شروع ہونے کے بعد ہی اردو اخبارات کا لب و لہجہ انگریز مخالف نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس سے قبل ہی باغیانہ تیور اختیار کر لئے تھے اور وہ سرفروشی کے جذبہ سے سرشار تھے۔

'حبیب الاخبار' بدایوں بھی مجاہدین کا حامی تھا جس کی پاداش میں اڈیٹر کو سزا ملی اور پریس ضبط ہو گیا۔ محمد عتیق صدیقی نے 'حبیب الاخبار' کے بارے میں تفصیلات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'حبیب الاخبار' باغیوں کا پرجوش حامی تھا۔ امن و امان قائم ہونے کے بعد، اڈیٹر کی سزا اور مطبع کی ضبطی کے ساتھ اس اخبار کا برا بھلا جو رسوخ تھا ختم ہو گیا۔ (5)

'اخبار مرتضائی' پشاور بھی حریت پسندوں کا حامی تھا۔ بعد کو اس کے مدیر کو باغیانہ مواد کی اشاعت کی بنا پر جیل بھیج دیا گیا اور اخبار بند ہو گیا۔ مرتضائی پر الزام تھا کہ اس نے 19 مئی 1857 کے شمارے میں ایک غلط اور اشتعال انگیز رپورٹ شائع کی ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ قلات غلزئی رجمنٹ نے بیرونی چوکیوں پر اپنے افسروں کو قتل کر دیا ہے۔

چشمہ فیض

ڈاکٹر طاہر مسعود نے پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈوں کی بنیاد پر صوبہ پنجاب سے شائع ہونے والے بعض ایسے اخباروں کی نشاندہی کی ہے جن پر باغیانہ مواد کی اشاعت کے لئے کارروائی کی گئی۔ منشی دیوان چند کا اخبار 'چشمہ فیض' سیالکوٹ جو کمپنی کا اعلانیہ مخالف تھا جنگ آزادی کے چھڑتے ہی اس کا لب ولہجہ جارحانہ ہو گیا۔ چنانچہ اس پر سنسر نافذ کر دیا گیا۔ اخبار 10 مئی سے 14 جون 1857 تک سنسر ہوتا رہا پھر اسے مطبع سمیت لاہور منتقل ہو جانے کی ہدایت کی گئی 27 جون کا شمارہ لاہور سے نکلا۔

'چشمہ فیض' لاہور 27 جون 1857 کے شمارے کا مطالعہ کرنے کے بعد طاہر مسعود نے لکھا ہے کہ:

> ''صفحہ اول کے نوٹس سے پتہ چلتا ہے کہ اخبار 'حسب منظوری حکام عالی مقام' لاہور منتقل ہوا تھا اور اتنی عجلت میں ہوا تھا کہ عملے اور مطبع کی منتقلی بھی مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ اخبار کے مندرجات سے گواہی ملتی ہے کہ وہ دباؤ اور ذہنی تناؤ کی کیفیت میں مرتب کیا گیا تھا۔ مجاہدین آزادی کو بار بار مفسد لکھا گیا اور انہیں شکستہ دل، مایوس اور ناکام بتایا گیا تھا۔ اس کے برعکس انگریزی فوج کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تھا۔ اخبار ایسا کرنے پر مجبور تھا کیونکہ لاہور میں اس کی کڑی نگرانی جاری تھی۔'' (6)

'چشمہ فیض' کے بارے میں 'اختر شہنشاہی' میں جو معلومات فراہم کی گئی ہے اس کے مطابق یہ اخبار سیالکوٹ سے جاری ہوا اس کے مالک دیوان چند تھے۔ چھ ورق پر مشتمل اخبار یوم سہ شنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ (7)

'چشمہ فیض' کے بارے میں یہ اطلاع دل چسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہ اخبار 'کوہِ نور' سے معاصرانہ چشمک رکھتا تھا۔ 'کوہِ نور' بنیادی طور پر انگریزوں کا حامی اور مجاہدین کا مخالف تھا۔

'گلشن نو بہار' پریس کی ضبطی

'گلشن نو بہار' کا اجراء کلکتہ سے 1854ء میں ہوا۔ اس کے اڈیٹر اور مالک کا نام عبدالقادر تھا۔ انھوں نے اخبار کے اجراء کے ساتھ ہی 'مطبع گلشن نو بہار' کے نام سے ایک پریس بھی قائم کیا تھا۔ وہ بڑی سخت اور طنز و تشنیع سے بھرپور زبان استعمال کرتے تھے۔ ان کی بے باکی بھی بے مثل تھی۔ 'گلشن نو بہار' اگر چہ خصوصی طور پر فارسی میں تھا مگر اس میں اردو کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ بزرگ صحافی جمنا داس اختر نے اپنے مضمون (محولہ بالا) میں 'گلشن نو بہار' کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا۔

''اس اخبار نے کھل کر نواب اودھ کی برطرفی، قید اور برطانوی سلطنت میں شامل کئے جانے کے خلاف لکھا تھا اس کے اڈیٹر جناب عبدالقادر تھے۔ اگر چہ یہ اخبار خصوصی طور فارسی میں تھا۔ مگر اس میں اردو کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ میرے پاس اس کا ایک شمارہ ہے۔'' (8)

1857 میں چھاپہ خانے کے قیام کو باضابطہ بنانے اور کچھ کتابوں کی اشاعت اور اخباروں کی تقسیم پر پابندی لگانے سے متعلق دفعہ XV پاس کی گئی۔ اس قانون میں 1823 کے ایڈم لائسنسنگ قانون کو دوبارہ شامل کیا گیا۔ اس قانون کے تحت حکومت کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی صوابدید پر لائسنس جاری کرے اور کسی بھی وقت اسے رد کر دے۔ اس قانون سے سرکار کو کسی بھی اخبار، کتاب یا کسی دیگر مطبوعہ چیز کی اشاعت اور تقسیم پر پابندی لگانے کا اختیار حاصل ہو گیا اور یہ قانون ایک سال (یعنی 13 جون 1858) تک نافذ العمل رہا۔

اس قانون کے تحت جس اخبار اور اس کے پریس کو سب سے پہلے نشانہ بنایا گیا وہ 'گلشن نو بہار' تھا۔ نٹراجن کے لفظوں میں:

''ایک دیگر اخبار 'گلشن نو بہار' کے پریس کو منافرت پھیلانے والا مضمون شائع کرنے کے سبب ضبط کر لیا گیا جس کے بعد اس اخبار کی اشاعت بند ہوگئی۔'' (9)

گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے بھی اپنے ایک مکتوب (مورخہ 4 جولائی 1857) میں بغاوت کے حالات کی اطلاع کورٹ آف ڈائریکٹرز کو دیتے ہوئے 'گلشن نو بہار' کا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ:

''کلکتے کے ایک لیتھوگرافک پریس کا اجازت نامہ بھی ہم نے منسوخ کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اس چھاپہ خانہ کا تمام سامان ضبط کر لیا جائے۔ یہ قدم ہم نے اس وجہ سے اٹھایا ہے کہ اسی چھاپے خانہ میں ایک فارسی اخبار 'گلشن نو بہار' چھپتا تھا۔ جس میں 21 ماہ حال کو دو انتہائی باغیانہ مضامین شائع ہوئے تھے۔'' (10)

لارڈ کیننگ نے مذکورہ مکتوب میں 'گلشن نو بہار' کے جن مضامین کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک مضمون کے اقتباسات کا انگریزی ترجمہ سرکاری کاغذات میں دستیاب ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عین اس دور میں جبکہ بغاوت پورے شباب پر تھی اور کمپنی کی حکومت کا سکہ عروج پر تھا۔ دیسی اخباروں نے یہ خبر طنزیہ انداز میں شائع کی تھی کہ 'اودھ کی طرز پر ٹراون کور' کی ریاست کو بھی سرکار بدانتظامی کی بنا پر ضبط کرنے والی ہے یہ بھی سنا جاتا ہے کہ الور کا علاقہ بھی کمپنی کی قلم رو میں شامل کر لیا جائیگا۔'' اسی خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے 'گلشن نو بہار' نے لکھا تھا کہ:

''پہلے تو سرکار کو چاہئے کہ وہ اس فتنہ وفساد کا سد باب کرے، جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گیا ہے، پھر اس کے بعد ملک گیری کی ہوس کرے۔ ہر شخص اس سے واقف ہے اور اب تو خود خداوندان الحاق (انگریز) کی سمجھ میں بھی آ گیا ہوگا کہ لکھنؤ (سرکار اودھ) کی ضبطی نے کیسا طوفان برپا کر دیا ہے اور خود ان ہی کے (انگریزوں کے) ہوا خواہوں کو کس تباہی سے دوچار کر دیا ہے۔

اس برے زمانے میں، اس (بغاوت) کا جو بھی نتیجہ نکلے لیکن حق یہ ہے کہ دہلی کے (لڑنے) والوں کو ہمت وشجاعت میں رستم کا بیٹا اور سکندر وقت کہنا چاہئے۔ اے خدا! ہمارے دشمنوں کو نیست ونابود اور ہمارے سلطان کی مدد کر۔'' (11)

'گلشن نو بہار' کے اڈیٹر عبدالقادر نے یہ باتیں انگریزوں کے دارالسلطنت کلکتے

میں بیٹھ کر لکھی تھیں جہاں پورے ہیبت و جبروت کے ساتھ کمپنی بہادر کی حکومت قائم تھی اور ان باتوں کو لکھ کر چھاپنے کے لئے بھی رستم وسکندر ہی کی ہمت درکار تھی۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ 'گلشن نو بہار' اور اس کے اڈیٹر عبدالقادر کے بارے میں زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ اس دور کے اخبارات کی سوانح عمری 'اختر شہنشاہی' میں صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ کلکتے کا اخبار تھا اور اس کا سنہ اجراء 1854ء ہے۔

'گلشن نو بہار' کے علاوہ بعض دیگر ہندوستانی اڈیٹرز بھی پریس ایکٹ کی زد میں آئے۔ باغیانہ مضامین چھاپنے کے جرم میں دوربین، سلطان الاخبار کے پرنٹر اور پبلشر پر سپریم کورٹ میں مقدمے چلائے گئے۔

حوالے

1۔ 'سحر سامری'، 15 دسمبر 1856

2۔ 'آفتاب عالمتاب' منشی شیو نارائن کا اخبار تھا اور وہی اس کے مدیر تھے۔ اس کا مطبع کشمیری بازار (دہلی) میں واقع تھا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا جس میں ایک ڈیڑھ صفحے میں 1857 کی تحریک کے متعلق واقعات درج ہوتے تھے۔ (اردو صحافت کی تاریخ: 245)

3۔ 'جنگ آزادی میں اردو صحافت کا حصہ' مطبوعہ ماہنامہ آجکل نومبر دسمبر 1983

4۔ محمد عتیق صدیقی: 'صوبہ شمال ومغربی کے اخبارات ومطبوعات' صفحہ: 263

5۔ محمد عتیق صدیقی: 'صوبہ شمال ومغربی کے اخبارات ومطبوعات' صفحہ: 273

6۔ 'اردو صحافت انیسویں صدی میں' صفحہ: 390

7۔ 'اختر شہنشاہی' صفحہ: 96

8۔ آجکل، نومبر دسمبر 1983

9۔ History of Indian Journalism, Page 80

10۔ Parliamentry Papers, Vol. 44, Pt. 1, Page 363
بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی، صفحہ: 405

11۔ 'گلشن نو بہار'، بحوالہ Martin: Indian Empire, Vol. II, Page No. 23

سنسر شپ

جب 1857 کے انقلاب کا آغاز ہوا، تو ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اخبارات کی آزادی سلب کرنے کی غرض سے وہ صحافتی قانون نافذ کیا جسے تاریخ صحافت میں قانون زباں بندی (Gagging Act) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت ہر چھاپہ خانہ کے لئے لائسنس لینا ضروری تھا۔ حکومت کو اختیار مل گیا کہ وہ جس اخبار کو چاہے بند کر دے اور جس اخبار کو چاہے سنسر شپ کی پابندی لگا دے۔ یہ قانون دیسی اور انگریزی دونوں قسم کے اخباروں پر جاری تھا۔ لارڈ کیننگ نے اپنی کونسل میں اس قانون کے جواز میں جو تقریر کی اس میں بتایا کہ پچھلے چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں مہیا کرنے کی آڑ میں دیسی باشندوں میں بغاوت کے جذبات پیدا کر دئے ہیں اور یہ کام نہایت مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ انہوں نے یوروپی صحافت کی وفاداری کو بہت سراہا، لیکن یہ بھی کہا کہ ہم نے دیسی اور یوروپی صحافت دونوں کے لئے اس غرض سے قانون نافذ کیا ہے کہ بعض اوقات انگریزی اخباروں میں بہ ظاہر بے ضرر چیزیں چھپتی ہیں لیکن جب ان کا ترجمہ دیسی اخباروں میں چھپتا ہے تو وہ خطرناک نوعیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔

13 جون 1857 کو جابرانہ Gagging Act کو جاری کرتے ہوئے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے قانون ساز کونسل کے سامنے جو تقریر کی وہ انگریز حکمرانوں کی پریشانی کو اجاگر کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"مجھے شک ہے کہ گزشتہ چند ہفتوں کے دوران دیسی پریس کے ذریعہ خفیہ اطلاعات کے نام پر پھیلائی گئی افواہوں کے نتیجے میں ہندوستان کی مقامی آبادی کے دلوں میں بغاوت کی آگ جس بے ہودہ حد تک بھڑکائی گئی ہے اس کو اچھی طرح سمجھا اور پہچانا گیا ہے۔ یہ کام ثابت قدمی، ہوشیاری اور فنکاری سے کیا گیا ہے۔ حقائق کو مسخ کرنے کے علاوہ گورنمنٹ کو بدنام کرنے اور اس کے مقاصد کو غلط رنگ میں پیش کرنے اور اس کی رعیت میں بے چینی اور منافرت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی گئی ہے۔"(1)

لارڈ کیننگ نے ان اخبارات پر بندش لگانے کی تجویز پیش کی اور اظہار رائے کی آزادی کو سلب کرنے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

"ہر مملکت کی زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب کہ بعض ایسی مراعات اور حقوق کو قربان کرنا پڑتا ہے جن کی حفاظت کرنا عام حالات میں حکومت کی ذمہ داری ہے۔ ہندوستان میں آج کل ایسی صورتحال ہے۔ ہمارے اوپر ایسا وقت آ گیا ہے کہ پریس کی آزادی کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آزاد پریس ایک آزاد مملکت کا قدرتی فریضہ معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے جابرانہ حکمرانی کا اور بالخصوص غیر ملکی غلبہ کا مخالف بھی ہوتا ہے جیسا کہ سر تھامس مونرو نے مختصر اور مدلل انداز میں کہا ہے "ایک آزاد پریس اور اجنبی لوگوں کا اقتدار دو متضاد چیزیں ہیں اور یہ ایک ساتھ زندہ نہیں رہ سکتیں۔" اس ملک میں ہماری حکومت صحیح معنوں میں ایک مقبول عام حکومت کبھی نہیں بن سکتی۔ اسے ایک ایسا جابرانہ طرز حکومت اختیار کرنا پڑے گا جس میں دانشمندانہ اور منصفانہ قوانین اور غیر جانبدار انتظامیہ کے ذریعہ لچک پیدا کی جائے۔

چنانچہ ایک جابرانہ طرز حکومت ہی اگر اس ملک کے حالات کے تحت مناسب ہے اور ہمارے سامنے یہی ایک ممکن راستہ ہے اور اگر پریس کی بے لگام آزادی موجودہ طرز حکومت سے اور اس ملک میں ہمارے اقتدار کی برقراری سے موافقت نہیں رکھتی تو پھر پریس کی آزادی پر روک لگانی پڑے گی۔ بہت زیادہ پابندیوں کی ضرورت نہیں لیکن حکومت کو منظم طور پر رسوا کرنے، حقائق کو توڑنے مروڑنے اور آبادی کے مختلف طبقوں کے درمیان اور بالخصوص یوروپین افسروں اور دیسی سپاہیوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی تمام کوششوں کی روک تھام کرنی پڑے گی۔'' (2)

اس ایکٹ کے تحت 1823 کے ایڈم ریگولیٹر کی دفعات کو معمولی ترامیم کے ساتھ سارے ہندوستان کے لیے ایک قانون کی شکل دے دی گئی۔ پریس کی آزادی پر یہ حملہ انگریز سامراج کی بوکھلاہٹ کو اجاگر کرتا تھا اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انقلابیوں کی طرح دیسی اخبارات انگریز سامراج کے لیے ایک ایسا چیلنج بن کر ابھرے تھے جس کا مقابلہ کرنے کی سکت ان میں نہیں تھی۔ اسی لیے ان اخبارات کی زباں بندی کی خاطر انھوں نے ایک ظالمانہ قانون کا سہارا لیا اور اس قانون کے نفاذ سے اخبارات کی آزادی مکمل طور پر سلب کر لی گئی۔

اینگلو انڈین اخباروں نے نئے قانون کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ ہر اخبار نے آزادی صحافت کو ایک سنہرا اصول قرار دیا لیکن صرف انگریزی صحافت کے لئے۔ 'لاہور کرانیکل' نے ایک اداریئے میں لکھا:

''ہمارے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ بہت سے دیسی اخبار سازش اور بغاوت میں مصروف ہیں لیکن یہ دلیل بہت بودی ہے کہ دیسی صحافت یا اس کے ایک جزو کی بغاوت پر اینگلو انڈین صحافت کو بھی قانون کی زنجیروں میں جکڑ لیا جائے۔'' (3)

اس کے برعکس 'دی پنجابی' جس نے اس قسم کی پابندیوں کو شہ دی تھی، اس ظالمانہ قانون کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا:

''دیسی صحافت نے عوام میں مقبولیت کے لئے نہ اعتدال پسندی کو بنیاد بنایا۔ نہ سچائی کو، اب اسے اپنے کئے کی سزا مل گئی ہے، کیونکہ وہ زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ دی گئی ہے اور شرارت کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ ہم نے تو کبھی یہ پالیسی پسند نہیں کی کہ ان اخبارات کو آزادی دے دی جائے جن کے چلانے والے اپنی عظیم جہالت کی وجہ سے زمانے بھر میں رسوا ہیں اور پرلے درجے کے ناشکرے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آج کی لگائی ہوئی پابندی کبھی نہیں اٹھائی جائے گی۔ کم از کم یہ ایک سو سال تک تو ضرور قائم رہے گی۔''(4)

جنگ آزادی 1857 کے ٹھیک دو ماہ بعد تحریر کئے گئے مذکورہ اداریے میں نہ تو کسی صحافی کی گرجدار آواز کی بازگشت ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی صحافتی اخلاقیات کو دخل ہے بلکہ یہ ہندوستانیوں کہ آئندہ 100 برسوں تک غلام بنائے رکھنے کی شدید خواہش کا اظہار ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ منشی محمد عظیم کے اخبار 'دی پنجابی' کو انگریزوں نے اپنے مفادات حاصلہ کے لئے 'پے رول' پر لے لیا تھا۔ اس لئے اس کے لب و لہجہ میں گورنر جنرل لارڈ کینگ کے الفاظ کی بازگشت صاف سنائی دے رہی تھی لیکن 'دی پنجابی' کے انگریز مدیر کی بدبختی یہ تھی کہ اس کا یقین باطل ثابت ہوا اور قانون زباں بندی ایک سو سال کی جگہ صرف ایک سال میں ہی دم توڑ گیا۔

پابندی کا پس منظر

مجموعی طور پر اجنبی راج کے بارے میں دیسی صحافت کا رویہ کوئی خاص معاندانہ نہیں تھا۔ صرف دو تین اخبار ایسے تھے، جو حکومت پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس کے باوجود 1857 کے آغاز میں انگریزی اخبارات نے مطالبہ کیا کہ دیسی اخباروں کو پابند کیا

جائے۔ مارچ 1857 میں آگرہ کے ہفت روزہ اخبار The Mofussilite نے اس رائے کا اظہار کیا کہ دیسی اخباروں پر سنسر شپ نافذ کر دیا جائے۔

'دی پنجابی' نے 28 مارچ کے شمارے میں لکھا:

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بہت سے دیسی اخبار ہماری فوج کے دیسی سپاہیوں میں تقسیم ہوتے ہیں ...... لیکن جب کوئی دیسی اخبار مذہبی جذبے سے سرشار ہوتا ہے، تو اس کی نوعیت بدتر ہو جاتی ہے ...... ہم ایسا لکھنے پر اس لئے مجبور ہوئے ہیں کہ ہماری توجہ لکھنؤ کے ایک ایسے دیسی اخبار کی طرف دلائی گئی ہے جو ہماری فوج میں پڑھا جاتا ہے اور اس نے بیرک پور کے ہنگاموں کی خبریں اس انداز میں پیش کی ہیں جن سے شرارت کا امکان ہے۔ (5)

اپریل میں بنگال کے مشہور اور با اثر روزنامے 'بنگال ہرکارو' نے اس بناء پر دیسی صحافت پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا کہ بنگال، بمبئی اور مدراس کے دیسی سپاہیوں میں اس کا بُرا اثر پڑا ہے۔

ان اقتباسات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ دیسی سپاہ میں دیسی اخبار کی مقبولیت سے انگریزوں کے کنٹرول والے اخبارات خوفزدہ تھے اور وہ اسی لئے ان اخبارات کی زباں بندی کے لئے ماحول سازی کر رہے تھے۔ بعد ازاں جب اخبارات کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے سامراجی طاقتوں نے قانون کا سہارا لیا تو ان اخبارات نے اپنی گردن بچانے کے لئے خوب تدبیریں۔

اس قانون کے تحت بہت سے اخباروں کے خلاف کارروائی ہوئی۔ کلکتہ میں تین دیسی اخبار بھی قانون کی زد میں آئے۔ ان کے نام تھے 'دور بین' 'سلطان الاخبار' اور 'سماچار سدھرشن' ان تینوں کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے ایک معزز اینگلو انڈین اخبار سے مغل حکمرانوں کا وہ شاہی فرمان نقل کیا جس میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیں اور اس فرمان کو زیادہ سے زیادہ

لوگوں تک پہنچائیں۔ سپریم کورٹ میں تینوں کے خلاف مقدمے دائر ہوئے۔ 'دوربین' اور 'سلطان الاخبار' کے اڈیٹروں نے اقبال جرم کرلیا اور عدالت نے انہیں ڈسچارج کردیا۔

کلکتہ کے فارسی اخبار 'گلشن نوبہار' نے 21 جون 1857 کے شمارے میں دو ایسے مضمون چھاپے جو شدید باغیانہ نوعیت کے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے خلاف نفرت پھیلائی جائے اور اس امر کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ لوگ حکام کی مزاحمت کریں۔'' جس پریس میں اخبار چھپتا تھا اس کا لائسنس منسوخ کردیا گیا اور پریس کی ساری مشینری اور دوسرا سامان ضبط کرلیا گیا۔ اس طرح 'گلشن نوبہار' خود بخود ختم ہوگیا۔

سر تھامس منرو جیسا روشن خیال اور لبرل خیالات کا ماننے والا بھی ہندستانی صحافت کو اس کے حقوق سے محروم رکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے ایک موقع پر کہا ہے:

> ''ہم نے اپنی سلطنت کی بنیادیں جن اصولوں پر استوار کی ہیں ان کی رو سے رعایا کو اخباروں کی آزادی نہ تو کبھی دی گئی اور نہ کبھی دی جائے گی ...... اگر ساری رعایا ہماری ہم وطن ہوتی تو میں اخباروں کی انتہائی آزادی کو ترجیح دیتا لیکن چونکہ وہ ہماری ہم وطن نہیں ہے اس لئے اس سے زیادہ خطرناک اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی...... اخباروں کی آزادی اور اجنبیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جو نہ تو ایک جگہ جمع ہوسکتی ہیں اور نہ مل کر ایک ساتھ چل سکتی ہیں۔ آزاد اخبار نویسی کا پہلا فرض کیا ہے؟ اس سوال کا یہی جواب ہوسکتا ہے کہ ملک کو بدیسی حکمرانوں سے نجات دلائی جائے۔ اگر یورپین اور ہندوستانی اخباروں کو آزادی دی گئی، تو اس کا بھی یہی نتیجہ ہوگا۔''(6)

اس ایکٹ کے تحت 1823 کے ایڈم ریگولیٹر کی دفعات کو معمولی ترامیم کے ساتھ سارے ہندوستان کے لیے ایک قانون کی شکل دے دی گئی۔ پریس کی آزادی پر یہ حملہ انگریز سامراج کی بوکھلاہٹ کو عیاں کرتا ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ

انقلابیوں کی طرح اردو کے یہ اخبارات انگریز سامراج کے لیے ایک ایسا چیلنج بن کر ابھرے تھے جس کا مقابلہ کرنے کی سکت ان میں نہیں تھی۔ اسی لیے ان اخبارات کی زباں بندی کی خاطر انھوں نے ایک ظالمانہ قانون کو نافذ کرنے کا سہارا لیا۔ اردو اخبارات نے 1857 کی جنگ آزادی کے دوران جو انقلابی کردار ادا کیا ہے اسے تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جانا چاہئے کیونکہ اردو صحافیوں نے قلم کی آزادی کی قیمت اپنے سروں کا نذرانہ پیش کر کے ادا کی۔ یہی اردو صحافت کا وہ سرفروشانہ کردار ہے جس پر ہم سب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

حوالے

1۔ ایم چلاپتی راؤ: 'صحافت'، صفحہ:84
2۔ ایضاً، صفحہ:86
3۔ 'لاہور کرانیکل'، 11 جولائی 1857
4۔ 'دی پنجابی'، لاہور، 11 جولائی 1857
5۔ 'دی پنجابی'، لاہور مارچ 1857
6۔ 'ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں'، صفحہ:5

کتاب کی تیاری کے دوران زیرِ مطالعہ رہنے والی کتابیں، مضامین اور مقالے

نام کتاب	مصنف	ناشر	سنِ اشاعت
1857			
اٹھارہ سوستاون، اخبار اور دستاویزیں	عتیق صدیقی	مکتبہ شاہراہ دہلی	1966
اٹھارہ سوستاون کی جنگ آزادی	سریندر ناتھ سین	پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی	2007
انقلاب 1857	پی سی جوشی	نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی	2007
تاریخ جنگ آزادی ہند 1857	سید خورشید مصطفےٰ رضوی	رضا لائبریری، رامپور	2000
ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی 1857 میں مسلمانوں کا حصہ	مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی	شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، دہلی	2008
صحافت			
اختر شاہنشاہی (سوانح عمری اخبارات)	سید محمد اشرف نقوی	مطبع اختر پریس، لکھنؤ	1888
اردو کے اخبار نویس	مولانا امداد صابری	صابری اکیڈمی، دہلی	1973
اردو صحافت پر ایک نظر	گربچن چندن	اردو اکادمی، دہلی	1986

Presented by: https://jafrilibrary.com/

اردو صحافت، انیسویں صدی میں	ڈاکٹر طاہر مسعود	فضلی سنز، کراچی	2002
اردو صحافت کا سفر	گربچن چندن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2007
انیسویں صدی کے اردو اخبارات	ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی	رضا لائبریری، رام پور	2005
اردو صحافت کی تاریخ	ڈاکٹر نادر علی خاں	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1987
آجکل اور صحافت	محبوب الرحمٰن فاروقی/محمد کاظم	پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی	2002
تاریخ صحافت	محمد افتخار کھوکھر	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	1995
تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ	ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی	اورنگ آباد	2007
تحقیقی مضامین	مالک رام	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	1984
جام جہاں نما: اردو صحافت کی ابتداء	گربچن چندن	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	1992
چند اہم اخبارات و رسائل	قاضی عبدالودود	ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ	1993
دہلی اردو اخبار	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی	1972
صحافت (دی پریس)	ایم چلاپتی راؤ، ترجمہ: راشد سہوانی	نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی	1987
صحافت، پاکستان و ہند میں	عبدالسلام خورشید	مجلس ترقی ادب، لاہور	1963
صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	1962
غدر کے اخبار	خواجہ حسن نظامی	دہلی	1940

Presented by: https://jafrilibrary.com/

قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان صحافی	پروفیسر عابدہ سمیع الدین	آئی اوایس، نئی دہلی	2007
محمد حسین آزاد	مظفر حنفی	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	1996
ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ	1962

رسائل واخبارات

سہ ماہی اردو ادب	(خصوصی شمارہ)	اڈیٹر: اسلم پرویز	اکتوبر تا دسمبر 2007
آجکل	(اردو صحافت نمبر)	اڈیٹر: راج نرائن راز	نومبر دسمبر 1983
آجکل	(پہلی جنگ آزادی پر خصوصی شمارہ)	اڈیٹر: خورشید اکرم	مئی 2007
آجکل		اڈیٹر: خورشید اکرم	اگست 2007
آجکل	(بلقیس موسوی، مولوی محمد باقر، دہلی)	اڈیٹر: خورشید اکرم	دسمبر 2007
سوونیر آل انڈیا اردو اڈیٹرز کانفرنس		اڈیٹر: عابدی الہ آبادی	1972
نیا دور، لکھنؤ	(انقلاب 1857 نمبر)	اڈیٹر: وضاحت حسین رضوی	اپریل مئی 2007
ماہنامہ العلم، کراچی		اڈیٹر: الطاف علی بریلوی	اکتوبر تا دسمبر 1971
قومی آواز، نئی دہلی	مضمون: اردو صحافت کی تاریخ	پنڈت وجے دت شری دھر	14،13 اکتوبر 1992

Presented by: https://jafrilibrary.com/

انگریزی و ہندی کتب اور مقالے

Author	Title	Publisher	Year
S. N. Sen	1857	Publication Division, New Delhi	1995
J. Natrajan	History of Indian Journalism	Publication Division, New Delhi	2000
Nadir Ali Khan	A History of Urdu Journalism	Idara Adabiyat, Delhi	1991
William Dylempral	The Last Mughal	Penguin	2007
Margret Pernau	The 'Delhi Urdu Akhbar' Between Persian Akhbarat and English Newspapers	Hudelberg University	Sep. 2002
Bhagwan S Gidwani	The Sword of Tipu Sultan	Allied Publisher, New Delhi	1989
Shafey Kidwai	The First War of Independence and Urdu Press	VIDURA	April-June 2007
Shirin Mosvi	Rebel Journalism Delhi Urdu Akhbar May- Sep. 1857	Peoples Democracy 29	April 2007
सुरेश गौतम वीणा गोतम	भारतीय पत्रकारिता	सत्साहित्य प्रकाशन दिल्ली	2001
प्रमीला शर्मा	स्वतंत्रता संधर्ष में उर्दू पत्रकारिता का योगदान	नव भारत टाईम्स नई दिल्ली 14-15 दिस्मबर	1992

خبردار پبلی کیشنز کی مطبوعات

(1)	فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس	(تحقیق)	وبھوتی نارائن رائے	100/-
(2)	شہر میں کرفیو	(ناول)	وبھوتی نارائن رائے	100/-
(3)	کیا ہوئے وہ لوگ	(شخصی خاکے)	معصوم مرادآبادی	80/-
(4)	حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان دہلوی	(تحقیق)	ڈاکٹر اصغر کمال	100/-
(5)	جہاں نور ہی نور تھا (زیرطبع)	(سفرنامہ حج)	معصوم مرادآبادی	50/-

گزشتہ پندرہ بیس سال میں جو نئے اردو صحافی سامنے آئے ہیں، ان میں معصوم مرادآبادی، صحافتی لیاقت، قومی سیاست پر گہری نظر، ملی اور سماجی مسائل سے قابل رشک حد تک واقفیت اور تجزیاتی صلاحیت کے اعتبار سے ایک اعلیٰ اور منفرد مقام کے حامل ہیں۔ چونکہ وہ اردو کے پوسٹ گریجویٹ ہونے کے علاوہ مدرسہ عالیہ (فتح پوری، دہلی) کے فیض یافتہ بھی ہیں، اس لیے انھیں زبان وبیان پر جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے، اس سے ان کے بیشتر ہم عمر اور ہم عصر صحافی قطعاً محروم نظر آتے ہیں۔ یہ صورت حال خاصی تشویشناک اور تکلیف دہ ہے۔ متعدد بیرونی ممالک کے متواتر دوروں نے معصوم کے صحافتی ذہن کو مزید کشادہ بنادیا ہے۔

کئی کتابوں کے مصنف معصوم مرادآبادی کی تازہ اور زیر نظر تصنیف 'اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857' اس حقیقت کی شاہد ہے کہ وہ صحافت کے نہایت ہی سنجیدہ اور زیرک طالب علم ہی نہیں، صحافتی تنقید وتحقیق کے مرد میدان بھی ہیں۔ انھوں نے انیسویں صدی میں شائع ہونے والے اخبارات، رسائل اور پہلی جنگ آزادی سے متعلق لکھی جانے والی اہم کتابوں کے تفصیلی اور دقیق مطالعہ کے بعد جو تجزیاتی نتائج اخذ کیے ہیں، ان سے خود میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ اس کتاب کو جو لوگ بھی پڑھیں گے، وہ یقیناً میرے خیال سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

میرا یہ بھی ایقان ہے کہ مستقبل میں جو لوگ بھی 'اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857' پر قلم اٹھائیں گے وہ معصوم مرادآبادی کی اس تصنیف کو نظر انداز کر کے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کرسکیں گے۔ ایسی حوالہ جاتی نوعیت کی کتابیں شاذونادر ہی منظر عام پر نظر آتی ہیں۔

معصوم مرادآبادی نے جس مختصری مدت میں اپنے پندرہ روزہ اخبار 'خبردار جدید' کو مقبول اور خود کفیل بنادیا ہے اور جس طرح اب ان کا روزنامہ 'جدید خبر' تیزی کے ساتھ صحافتی دنیا میں قدم جمارہا ہے، وہ ان کی بے پایاں محنت، لگن اور ثابت قدمی کا روشن ثبوت ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں حاسدوں کی نظر بد سے محفوظ رکھے اور وہ اسی طرح ترقی کے راستے پر گامزن رہیں۔

فضیل جعفری